لوہے کا آدمی
اشتیاق احمد

محمود • فاروق • فرزانہ
اور — انسپکٹر جمشید سیریز
متفرق سلسلہ نمبر ۲
لوہے کا آدمی
اشتیاق احمد

نام ناول ——— لوہے کا آدمی
طابع ——— اشتیاق احمد
کتابت ——— سعید نامدار
قانونی مشیر ——— نسیم اعجاز ایڈووکیٹ
سرورق ——— محمد مقصود عُلید
مطبع ——— افضل شریف پرنٹرز
قیمت ——— ۱۰ روپے

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کی عیادت کی (اس کے پوچھنے کو تشریف لے گئے بیماری میں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا، تیرا جی کسی چیز کے کھانے کو چاہتا ہے؟ وہ بولا، جی ہاں! گیہوں کی روٹی کھانے کو جی چاہتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس شخص کے پاس گیہوں کی روٹی ہو، وہ اپنے بھائی کو بھیج دے۔ پھر اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب تم میں سے کوئی بیمار ہو اور وہ کسی چیز کی خواہش کرے تو اس کو کھلائی جائے (بشرطیکہ وہ چیز اس کو مضر نہ ہو)

سنن ابن ماجہ شریف، جلد سوم،
صفحہ نمبر ۹۵، حدیث نمبر ۳۲۵

○

دو باتیں

السلام علیکم! پرانے ناول دوبارہ دس سال بعد شائع کرتے وقت ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ میں آج تک اس عجیب سی خوشی کی اصل وجہ نہیں سمجھ سکا۔ اگر آپ کی سمجھ میں اس کی وجہ آگئی ہے تو مجھے اس الجھن سے نجات حاصل کرنے میں مدد ضرور دیجیے گا۔ اور اگر وجہ آپ کی سمجھ میں بھی نہ آئی ہو تو ایک خط لکھ کر بتا دیجیے گا کہ آپ بھی میرے ساتھ اس کشتی کے سوار ہیں۔ اس طرح مجھے خوشی حاصل ہو گی اور میں اس ایک اور خوشی کی وجہ جاننے کے چکر میں گھن چکر بننے سے بچ جاؤں گا۔ اور آپ جانتے ہی ہیں یہ تو اتنے بے تکے سے دو خوشیوں کی صدائیں ہیں۔

پتا نہیں، کیا لکھ گیا ہوں۔ پڑھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کرنا آپ کا کام ہے۔

ابن صفی

شیخ صاحب ناشتے کی....

شیخ صاحب ناشتے کی میز پر اپنے مہمان کا انتظار کر رہے تھے۔ جب وہ نہ آیا تو انھوں نے اپنے ملازم کریم خان کو اس کے کمرے کی طرف بھیجا، تاکہ معلوم کرے، کیا بات ہے۔ ملازم نے واپس آکر بتایا کہ مہمان اپنے کمرے میں نہیں ہیں....

"کمرے میں نہیں ہیں.. تو باتھ روم کا دروازہ کھٹکھٹایا ہوتا۔" شیخ افتخار احمد صاحب نے منہ بنا کر کہا۔

"باتھ روم کا دروازہ کھلا ہے۔ وہ اس میں بھی نہیں ہیں۔"

"اوہ ___ تو پھر باغ میں جا کر دیکھو، وہ چہل قدمی کرنے نکل گئے ہوں گے۔" انھوں نے کہا۔

"جی بہتر۔" ملازم نے کہا اور تیز تیز چلتا باغ کی طرف چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔ اس نے کہا:

"جناب! وہ باغ میں بھی نہیں ہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" ان کے منہ سے نکلا، ساتھ ہی وہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

پہلے وہ مہمان کے کمرے میں آئے... ادھر اُدھر دیکھا، باتھ روم

کے اندر نظر ڈالی، پھر باغ میں گھوم پھر کر دیکھا اور اس کے بعد کوٹھی کے سبھی کمرے دیکھ ڈالے، لیکن مہمان تو اس طرح غائب تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

آئی جی صاحب سر پکڑ کر بیٹھ گئے... ان کے مہمان کا نام فواد محمد صدیقی تھا۔ چند روز پہلے وہ ان کے ایک دوست کا خط لے کر دوسرے شہر سے آیا تھا... آئی جی صاحب کے دوست نے لکھا تھا کہ صدیقی صاحب ان کے دوست ہیں، وہ یہاں ایک ضروری کام سے آئیں گے اور چند دن ٹھہریں گے، میں نے ان کے لیے آپ کا گھر پسند کیا ہے۔ امید ہے، انہیں مہمان رکھنا آپ کو ناگوار نہیں گزرے گا۔

خط آئی جی صاحب کے بہت ہی قریبی دوست نے لکھا تھا، اس کے لیے تو وہ جان تک دینے کے لیے تیار تھے... ان کے دوست کا نام شاہد منیر تھا۔ اور وہ بھی سرکاری ملازم تھے... انہوں نے بڑی خوشی سے صدیقی صاحب کو رہنے کی اجازت دے دی۔ ان کے لیے ایک کمرہ ٹھیک کرا دیا... ملازم کو ہدایت کر دی کہ انہیں جس کی ضرورت ہو، فوراً دی جائے۔ انہیں رہتے ہوئے چند دن ہو گئے تھے۔ شیخ صاحب صبح کا ناشتا اور رات کا کھانا ان کے ساتھ تناول کرتے تھے... اور اس وقت بھی وہ ناشتے کے لیے ان کا انتظار کر رہے تھے کہ معلوم ہوا مہمان غائب ہے۔

ایک بار پھر وہ مہمان کے کمرے میں آئے۔ یہاں کسی بے ترتیبی

کے آثار نہیں تھے۔ ہر چیز سلیقے سے رکھی تھی۔ البتہ بستر کی چادر پر کوئی سلوٹ نہیں تھی، اور اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ مہمان رات کو بستر پر سویا ہی نہیں... تو پھر... کیا وہ رات کو ہی یہاں سے چلے گئے... آخر اس طرح چپ چپاتے جانے کی انہیں کیا ضرورت پیش آ گئی تھی۔ وہ سوچ میں ڈوب گئے۔ ان کی الجھن لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی... اچانک انہیں اپنے دوست شاہد منیر کا خیال آیا۔ انہوں نے فوراً اس سے فون پر رابطہ قائم کیا۔

"ہیلو منیر... میں افتخار احمد بول رہا ہوں... دارالحکومت سے!"

"ارے شیخ صاحب... آپ کیسے خیر تو ہے... اور ہاں... میرے دوست صدیقی کا کیا حال ہے؟" دوسری طرف سے خوشی سے بھرپور آواز میں کہا گیا۔

"میں نے اس وقت فون انہی کے لیے کیا ہے۔" شیخ صاحب نے کہا۔

"جی... کیا مطلب..." شاہد منیر نے چونک کر پوچھا۔

"صدیقی کو تم کب سے جانتے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"آخر بات کیا ہے؟" اس مرتبہ دوسری طرف سے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا گیا۔

"پہلے تم بتاؤ تو سہی — صدیقی کو کب سے جانتے ہو، وہ تمہارا دوست کب سے بنا ہے اور یہاں کیا کرنے کے لیے آیا ہے؟"

"شیخ صاحب... آپ کے سوالوں نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ خدا جانے بات کیا ہے، بہرحال میں بتاتا ہوں... انوار احمد صدیقی سے میری ملاقات ایک پارٹی میں ہوئی تھی... ہم وہیں ایک دوسرے سے گھل مل گئے اور اس کے بعد بھی اکثر ملتے رہے۔ اس بات کو دو سال ہو چکے ہیں... ہماری دوستی روز بروز مضبوط ہوتی جا رہی ہے...... دارالحکومت میں اسے کوئی ذاتی کام تھا... مجھ سے ذکر کرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا کہ یہاں میرا کوئی دوست ہے یا نہیں... میرا آپ سے اچھا دوست یہاں کون ہوتا، میں نے آپ کا نام لے دیا، کہنے لگا ان کے نام رقعہ لکھ دو، میں چند دن اُن کے ہاں ٹھہر کر اپنا کام کرواؤں گا۔ میں نے اس میں کوئی حرج نہ سمجھا اور رقعہ لکھ دیا۔ اب آپ بتائیے ـــــ بات کیا ہے، میری پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے" یہ کہہ کر شاہد منیر خاموش ہو گیا۔

"تو پھر سنو ـــــ رات کا کھانا کھا کر ہم سونے کے لیے اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ صبح جب میں نے ملازم کو اُن کے کمرے میں بھیجا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے کمرے میں نہیں ہیں ـــــ پورے گھر میں اُنہیں دیکھا گیا، مگر ان کا دور دور تک پتہ نہیں چلا ـــــ اب میں حیران ہوں، وہ بتائے بغیر رات کو نہ جانے کس وقت کہاں چلے گئے ـــــ بستر کی چادر پر کوئی سلوٹ نہیں ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رات کو بستر پر سرے سے سوئے ہی نہیں۔"

"اوہ ـــــ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"میں نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ اس کا مطلب ہے... تم بھی ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ خیر میں دیکھتا ہوں کہ اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور دوبارہ کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگے۔

انسپکٹر جمشید ناشتے کی میز پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے... بیگم جمشید باورچی خانے میں مصروف تھیں۔ اتنے میں محمود، فاروق اور فرزانہ کسی بات پر جھگڑتے ہوئے ناشتے کی میز پر آ گئے۔

"میں کہتی ہوں ـــــ یہ غلط ہے۔"

"نہیں ـــــ یہ بالکل ٹھیک ہے۔" فاروق نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"اور میں کہتا ہوں، یہ نہ ٹھیک ہے، نہ غلط۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

انسپکٹر جمشید اخبار پر سے نظریں ہٹا کر انہیں حیرت زدہ انداز میں دیکھنے لگے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ وہ کس بات پر جھگڑ رہے ہیں پھر انہیں محمود کے جملے کا خیال آیا۔ انہوں نے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے محمود ـــــ ایک بات نہ غلط ہے نہ درست۔"

"جی ہاں ـــــ ان دونوں کا خیال بالکل غلط ہے۔" محمود نے وضاحت کرتے

کے سے انداز میں کہا۔

"جی نہیں... تمہارا اور فرزانہ کا خیال بالکل غلط ہے۔" فاروق نے پُرزور لہجے میں کہا۔

"غلط — بالکل غلط — دراصل فاروق تمہارا اور محمود کا خیال غلط ہے۔" فرزانہ نے تیز آواز میں کہا۔

"میرا خیال ہے، تم تینوں ٹھیک ہو... غلط تو میں ہوں۔" انسپکٹر جمشید جھلا اُٹھے۔

"اوہ ابا جان۔ سوری — ہم بحث میں بہت آگے بڑھ گئے۔" محمود بولا۔

"بہت آگے تو نہیں... ناشتے کی میز تک ہی آئے ہیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"مجھے پِٹے جملے نہ بولا کرو۔" فرزانہ نے اس سے بھی زیادہ برا منہ بنایا۔

"ہاں... بلکہ ہرگز، ہرگز نہ بولا کرو۔" محمود مسکرایا۔

"بات کیا ہو رہی تھی... اور تم جملوں پر آ گئے — میں پوچھتا ہوں وہ کیا بات تھی جس پر تم تینوں جھگڑ رہے تھے۔" انسپکٹر جمشید الجھن میں مبتلا ہو گئے۔

"دراصل ابا جان! میں کہہ رہا تھا کہ مرغی کے انڈے پر اگر ہاتھی بھی کھڑا ہو جائے تو — وہ نہیں ٹوٹتا... فرزانہ کا خیال ہے، یہ بات غلط ہے جب کہ محمود کہتا ہے نہ یہ غلط ہے، نہ یہ ٹھیک۔"

"اگرچہ یہ ایک فضول سی بحث ہے، تاہم میں محمود سے

یہ ضرور پوچھنا چاہوں گا کہ بیک وقت دو باتیں کس طرح ہو سکتی ہیں یعنی نہ غلط نہ درست۔" انسپکٹر جمشید نے قدرے مسکرا کر کہا۔

"وہ اس طرح ابا جان... دیسی مرغی کے انڈے تو شاید ہاتھی کا بوجھ سہہ سکیں... لیکن مجھے یقین ہے ولایتی مرغی کے انڈوں پر ہاتھی ہرگز ہرگز کھڑا نہیں ہو سکتا۔"

محمود کی بات پر انسپکٹر جمشید کی ہنسی نکل گئی۔ اس وقت بیگم جمشید ناشتے کی ٹرے اٹھائے میز کی طرف آتی نظر آئیں۔

"اور فرزانہ تم اس بات کو غلط کس طرح کہتی ہو؟"

"اس طرح ابا جان کہ ہاتھی کا وزن... خدا کی پناہ — ایک ننھا منا سا انڈا اس کا بوجھ کس طرح سہار سکتا ہے، یہ بات میرے حلق سے تو اترتی نہیں۔" فرزانہ نے کہا۔

"بھئی تم اسے حلق کی بجائے ذہن میں اتار لو نا۔" فاروق مسکرایا... محمود اور انسپکٹر جمشید کو ہنسی آ گئی۔

"یہ صبح صبح کیا اتارا جا رہا ہے؟" بیگم جمشید منہ بنا کر بولیں۔

"ہاتھی — حلق میں نہیں اتر رہا ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ہاتھی — لیکن وہ تو حرام ہوتا ہے۔" بیگم جمشید نے حیرت زدہ لہجے میں کہا اور سب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"اپنی باتیں آپ خود ہی جانیں۔ اگر آج صرف قہقہوں سے ہی ناشتہ کرنے کا پروگرام ہو تو یہ ٹرے واپس لے جاؤں۔"

"ارے نہیں امی جان — قہقہوں سے بھی کہیں پیٹ بھرا ہے۔"

"امی جان — کیا باورچی خانے میں کوئی کچا انڈا موجود ہے؟" فاروق نے پوچھا۔

"کیوں؟" انہوں نے ایک دم پوچھا۔

"اور وہ بھی دیسی مرغی کا۔" محمود بول اٹھا۔

"آخر کیا کرنا ہے انڈے کا۔" بیگم جمشید نے پوچھا۔

"توڑ کر دیکھیں گے۔"

"میں ہر روز ہی باورچی خانے میں توڑتی رہتی ہوں — دیکھ لیا کرو آکر۔" بیگم جمشید نے منہ بنایا اور چائے بنانے لگیں۔

"بات یہ ہے امی جان، کہا جاتا ہے کہ انڈے پر ہاتھی بھی کھڑا ہو جائے تو بھی وہ نہیں ٹوٹتا... اس بارے میں فاروق کا خیال ہے کہ یہ بالکل ٹھیک بات ہے... فرزانہ کا خیال یہ ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا... ایک کمزور سا انڈا ہاتھی کا وزن نہیں اٹھا سکتا، جب کہ میرا خیال ہے کہ اگر انڈا دیسی مرغی کا ہو تو وہ ضرور ہاتھی کا وزن برداشت کر لے گا۔"

"تو پھر... تم چاہتے کیا ہو؟" بیگم جمشید نے الجھ کر پوچھا۔

"ہم... ہم یہ تجربہ کرنا چاہتے ہیں۔" فاروق نے جلدی سے کہا۔

"لیکن تم انڈے پر کھڑا کرنے کے لیے ہاتھی کہاں سے لاؤ گے؟"

بیگم جمشید کے منہ سے نکلا اور کمرے میں قہقہے گونج اٹھے۔

ٹھیک اسی وقت بیگم شیرازی اندر داخل ہوئیں... وہ انہیں قہقہے لگاتے دیکھ کر حیران کھڑی رہ گئیں... آخر اس نے کہا۔

"اگر آپ لوگ اسی طرح ہنستے رہے تو فون کرنے والا تنگ آکر سلسلہ منقطع کر دے گا۔"

"اوہ کس کا فون ہے آنٹی؟" محمود نے چونک کر کہا۔

"نام تو انہوں نے بتایا نہیں... البتہ بھائی جان سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"اوہ اچھا — میں دیکھتا ہوں۔"

انسپکٹر جمشید اٹھ کر چلے گئے۔ بیگم شیرازی کو بیگم جمشید نے بیٹھنے پر مجبور کر دیا اور انہیں چائے کا کپ بنا کر دے دیا۔ دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ انسپکٹر جمشید تیز تیز قدم اٹھاتے اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے جلدی جلدی کہا۔

"آئی جی صاحب کا فون تھا... ان کا مہمان گھر سے غائب ہو گیا ہے۔ میں وہاں جا رہا ہوں — تم ناشتا کر کے سکول چلے جانا۔"

"مہمان غائب ہو گیا۔" تینوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

غسل خانے میں

"بات کچھ پلّے نہیں پڑی۔ مہمان کے غائب ہونے کا بھلا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟" محمود نے انسپکٹر جمشید کے جانے کے بعد کہا۔

"مہمان کے غائب ہونے کا مطلب تو مہمان کا غائب ہونا ہی ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"ہش... وہ کیوں غائب ہو گیا؟" محمود تڑخ سے بولا۔

"اور کہاں غائب ہو گیا؟" فرزانہ نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔

"ارے ارے۔ میں کیا جانوں۔ اسے میں نے تھوڑا ہی غائب کیا ہے۔" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

"آؤ بھئی... ہم اندر بیٹھ کر باتیں کریں... ان کی تو شروع ہو گئی بحث۔" بیگم جمشید نے کہا، پھر اٹھتے ہوئے ان سے بولیں۔

"بحث میں سکول کا وقت نہ نکال دینا۔"

"آپ فکر نہ کریں امی جان۔ یہ بحث اتنی لمبی ثابت نہیں ہوگی کیوں کہ مہمان تو غائب ہو چکا ہے۔"

وہ دونوں چلی گئیں تو فرزانہ نے کہا:

"سچ بات تو یہ ہے کہ میرا آج سکول کی بجائے آئی جی صاحب

کی کوٹھی جانے کو جی چاہ رہا ہے۔ مگر ابا جان اسے پسند نہیں کریں گے۔"

"لہٰذا... ہم سکول ہی جائیں گے..." محمود نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

"لیکن ذہن میں تو مہمان اچھل چھاتا رہے گا نا۔" فاروق نے جھلا کر کہا۔

"تو پھر... کیا کیا جا سکتا ہے؟"

"اگر کچھ نہیں کیا جا سکتا... تو وقت ضائع کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ آؤ سکول چلتے ہیں۔ واپسی پر معلوم کریں گے کہ مہمان کا کیا بنا؟ وہ ملا یا نہیں... اگر مل گیا ہے تو کہاں اور نہیں ملا تو کیوں... وغیرہ وغیرہ۔" فاروق نے جلدی سے کہا۔

"زبان کی رفتار ملاحظہ ہو۔" فرزانہ نے جل کر محمود سے کہا۔

"روز ہی دیکھتے ہیں۔ کون سی نئی بات ہے۔" محمود بولا۔

"یہ تو سوچو... آئی جی صاحب کا مہمان ہو اور غائب ہو جائے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے... کتنی حیرت انگیز۔"

"سوچ چکے ہیں۔ تم کچھ بھی کہہ ڈالو۔ ہمیں سکول جانا ہی ہوگا۔ اگر سکول سے چھٹی ہوتی تو اور بات تھی، پھر تو ہم خود ان سے کہہ سکتے تھے کہ ہمیں بھی ساتھ لے چلیے۔" محمود نے کہا۔

"بھئی اس میں مایوس ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا تم شرلاک ہومز کو بھول گئے؟" فرزانہ چہکی۔

"یہ شرلاک ہومز کہاں سے ٹپک پڑا؟" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"آسمان سے؟" فاروق بول اٹھا۔

"میرا مطلب ہے۔ شرلاک ہومز بھی تو سارا کیس گھر بیٹھے بیٹھے حل کر لیا کرتا تھا۔۔۔ ہم بھی آئی جی صاحب کی کوٹھی جائے بغیر معلوم کر سکتے ہیں کہ مہمان کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔ مثلاً پہلا خیال تو یہ ہو سکتا ہے کہ اسے اغوا کر لیا گیا ہوگا۔ اگر اس کا امکان نہ ہو تو پھر یہ سوچا جائے گا کہ مہمان خود ہی کہیں چلا گیا ہے۔۔۔۔ اسے اچانک کہیں جانا پڑ گیا۔۔۔ اور رات کے وقت اس نے آئی جی صاحب کو پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور گھر کا دروازہ کھول کر چلا گیا۔۔۔" فرزانہ کہتی جا رہی تھی کہ محمود نے ٹوک دیا۔

"لیکن وہ کوئی پیغام تو چھوڑ کر جا سکتا تھا۔"

"ہاں۔۔۔ لیکن اس کے پاس قلم نہیں تھا۔ رات کے وقت وہ قلم کہاں سے لاتا۔۔۔۔ لہٰذا اس نے چپ چپاتے ہی چلے جانا مناسب سمجھا۔" فرزانہ نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"لیکن اس سے پہلے ہمیں یہ بھی معلوم ہونا ضروری ہے کہ صبح سویرے دروازہ اندر سے بند ملا تھا یا کھلا۔" فاروق بھی بول پڑا۔

"ظاہر ہے کہ کھلا ہی ملا ہوگا، ورنہ مہمان اندر نہ ملا ہوتا۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"میرا خیال ہے ہم تینوں میں ابھی شرلاک ہومز جتنی عقل نہیں ہے۔ اس طرح گاڑی آگے نہیں بڑھے گی آؤ سکول کی تیاری کریں۔"

"اچھا۔"

وہ سکول جانے کے لیے تیار ہوئے اور گھر سے باہر نکلنے ہی والے تھے کہ بیگم شیرازی نے ایک بار پھر فون کی اطلاع دی۔

انسپکٹر جمشید طوفانی رفتار سے موٹر سائیکل چلاتے آئی جی صاحب کے ہاں پہنچے۔ وہ برآمدے میں بے تابی کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔۔۔۔

"آؤ جمشید ــــ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ میں بہت پریشان ہوں۔"

"فکر نہ کریں۔ ابھی سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے ــــ سب سے پہلے آپ یہ بتائیے کہ مہمان تھے کون؟"

"میرے ایک دوست ہیں۔۔۔ شاہد منیر ــــ مہمان ان کا دوست تھا۔ وہ دار الحکومت میں کسی کام کی غرض سے آیا تھا۔ شاہد منیر نے اسے میرا پتا دے دیا۔ وہ اس کا رقعہ بھی لایا تھا۔۔۔ مہمان کا نام انور احمد صدیقی تھا وہ چار پانچ روز سے میرے گھر ٹھہرا ہوا تھا۔ میں نے فون پر شاہد منیر سے بھی بات کی ہے۔ اس کی ملاقات انور صدیقی سے ایک پارٹی میں ہوئی تھی اور دونوں دوست بن گئے تھے۔"

"بہت خوب۔۔۔ اب مجھے اس کا کمرہ دکھا دیجیے۔ تاکہ میں کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔"

آئی جی صاحب انہیں مہمان کے کمرے میں لے آئے۔ کمرہ جوں کا توں پڑا تھا۔ کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا گیا تھا۔ انسپکٹر جمشید نے کمرے کا بغور جائزہ لیا، پھر کہنے لگے:

"صاف اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مہمان رات کو بستر پر سونے کے لیے نہیں لیٹا۔۔ کیا اس کا سامان یہیں موجود ہے۔ یا وہ اپنے ساتھ لے گیا؟"

"وہ جب آیا تھا تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پلاسٹک بیگ تھا۔۔۔ ملازم نے یہ بیگ اس کے کمرے تک پہنچایا تھا۔"

"بہتر ہے ملازم کو بلا لیجیے۔" انسپکٹر جمشید نے پُرسکون آواز میں کہا، مگر وہ اندرونی طور پر فکر مند ہوتے جا رہے تھے۔ ملازم کے آنے پر انہوں نے اس سے سوال کیا:

"مہمان کا بیگ تم اوپر لائے تھے؟"

"جی ہاں۔"

"کیا تم بتا سکتے ہو، اس میں کیا تھا؟"

"کپڑوں کے صرف دو جوڑے۔ جو میں نے مہمان کے کہنے پر کپڑوں کی الماری میں لٹکا دیے تھے اور بیگ بھی اس کے نچلے خانے میں رکھ دیا تھا۔" ملازم نے بتایا۔

"کیا مطلب۔۔۔ بیگ میں دو جوڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا؟"

"جی نہیں۔" اس نے کہا۔

"ذرا کپڑوں کی الماری تو کھول کر دیکھنا۔" انسپکٹر جمشید کی حیرت لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ ملازم نے آگے بڑھ کر الماری کھولی اور دوسرا لمحہ چکرا دینے والا تھا۔

الماری میں نچلے خانے میں بیگ جوں کا توں موجود تھا۔۔۔ اور مہمان کے دونوں جوڑے الماری میں لٹکے ہوئے تھے۔

"اس کا مطلب ہے۔۔۔ وہ اپنا بیگ، اور کپڑے بھی نہیں لے کر گیا۔ اچھا یہ بتائیے۔۔۔ اس کے پیروں میں تو جوتے ہوں گے۔۔۔ یا پھر کیا چپل آپ نے مہمان کو دی گئی تھی، کیوں کہ بیگ میں تو اور کچھ بھی نہیں تھا۔"

"ہاں، وہ جب آیا تھا تو اس کے پیروں میں جوتے تھے۔" آئی جی صاحب بولے۔

"بہت بہتر۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ جوتے پہن کر گیا ہے یا چپل؟"

"آخر اس بات سے تم کیا نتیجہ نکالو گے؟" آئی جی صاحب نے جھلا کر کہا۔

"اگر وہ اپنے جوتے پہن کر گیا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ پورے سکون اور اطمینان سے گیا ہے اور اگر چپل پہنے چلا گیا ہے تو ضرور گھبراہٹ اور افراتفری میں گیا ہے۔ مگر نہیں۔۔۔ پہلے یہ بتائیے۔ کیا آپ نے اپنی تمام چیزوں کا جائزہ لے لیا ہے؟"

"کیا مطلب؟" آئی جی صاحب چونکے۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی چیز یہاں سے لے اُڑا ہو۔"

"ہم.... مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے.... وہ میرے دوست کا دوست ہے۔" وہ ہکلائے۔

"اس بات کو چھوڑیے اور جلد از جلد اپنی تمام قیمتی چیزوں اور کاغذات وغیرہ کو دیکھ لیجیے اور اگر دفتر کی کوئی خفیہ فائل گھر میں موجود تھی، تو اسے بھی دیکھ لیں۔"

آئی جی صاحب بوکھلا اُٹھے۔ اس پہلو پر تو انھوں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف دوڑے.... انسپکٹر جمشید بھی ان کے پیچھے تھے۔ آدھ گھنٹے کی دیکھ بھال کے بعد آئی جی صاحب نے سکھ کا سانس لیا اور بولے:

"سب چیزیں موجود ہیں۔"

"بہت خوب۔ اب ہم پھر مہمان کے کمرے میں چلیں گے۔"

ملازم بھی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ مہمان کے کمرے میں آکر انھوں نے جوتے کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ پلنگ کے نیچے جوتے موجود تھے۔

"اس کا مطلب ہے، وہ افراتفری کے عالم میں یہاں سے گیا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے.... "ذرا میں غسل خانے پر بھی ایک نظر ڈال لوں۔ پھر اس کی تلاش کا سلسلہ شروع کیا جائے گا۔ بہرحال ہمارے لیے فکرمند ہونے والی کوئی بات نہیں۔ وہ کچھ اٹھا کر نہیں لے گیا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے انسپکٹر جمشید غسل خانے میں گھس گئے۔ آئی جی صاحب اور ملازم کمرے میں ہی کھڑے رہ گئے۔ پھر انھوں نے انسپکٹر جمشید کی چیخ کی آواز سنی۔ دونوں بوکھلا کر غسل خانے کی طرف بھاگے۔ انھوں نے دیکھا.... انسپکٹر جمشید غسل خانے کے فرش کے بیچوں بیچ حیرت کے مارے بُت بنے کھڑے ہیں۔ ان کی آنکھیں باہر کو اُبل آئی تھیں۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا اور چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا۔

آئی جی صاحب نے گھبرا کر غسل خانے کو دیکھا.... مگر انھیں وہاں کچھ بھی نظر نہ آیا۔ ان کی حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ انھوں نے گھبرا کر کہا:

"جمشید.... جمشید.... تمھیں کیا ہو گیا ہے؟"

"جی ــــ" انسپکٹر جمشید زور سے چونکے اور پھر ان کی آنکھوں میں بے پناہ خوف سمٹ آیا۔ ان کی نظر غسل خانے کے ایک کونے پر جم کر رہ گئی۔

آئی جی صاحب اور ملازم نے بھی ان کی نظروں کے تعاقب میں اس طرف دیکھا اور پھر انھیں بھی ایک زوردار جھٹکا لگا۔

اچانک انسپکٹر جمشید دوڑتے ہوئے غسل خانے سے نکل آئے۔

مہمان کہاں گیا؟

تینوں فون تک آئے... دوسری طرف اُن کے والد انسپکٹر جمشید تھے...

"ہیلو... محمود... تم ہو... سنو... سکول جانے کا پروگرام کینسل کر دو اور فوراً آئی جی صاحب کے گھر پہنچ جاؤ۔"

"جی!!" محمود نے حیرت زدہ لہجے میں کہا، لیکن دوسری طرف سے سلسلہ بند کر دیا گیا تھا۔

محمود نے فاروق اور فرزانہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرت بھی تھی اور خوشی بھی۔

"خیر تو ہے؟" فرزانہ نے بے تابی کے عالم میں کہا۔

"ہم سکول نہیں جا رہے ہیں۔" اس نے کہا۔

"کیوں... سکول بند ہو گیا ہے... یا اس کی چھت گر گئی ہے؟" فاروق بولا۔

"کم از کم میرے سکول کی چھت تو نہیں گر سکتی... کیوں کہ وہ بہت مضبوط ہے۔" فرزانہ مسکرائی۔

"یہ بات نہیں۔ ابا جان نے ہمیں آئی جی صاحب کے گھر بلایا

ہے۔" آخر محمود نے انہیں بتایا۔

"اوہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی گڑبڑ ہے!" فرزانہ نے چونک کر کہا۔

"یہی نظر آتا ہے... آؤ چلیں۔ انہوں نے فوراً آنے کے لیے کہا ہے۔"

وہ جلدی سے باہر نکلے، امی جان کو بتایا اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر آئی جی صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

"یہ مہمان کا چکر تو لمبا ہوتا نظر آتا ہے۔" محمود نے کہا۔

"ایک یہی کیا... ہمیں تو جو چکر بھی پیش آتا ہے، وہ لمبا ہی ہو جاتا ہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"اب کیوں جان نکل رہی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے تو آئی جی صاحب کے ہاں جانے کے لیے بے چین تھے۔" فرزانہ نے جل بھن کر کہا۔

"میں نہیں... تم دونوں۔"

"تو پھر تم ٹیکسی سے اتر جاؤ اور سکول پہنچ جاؤ۔" محمود نے تلملا کر کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ابا جان نے ہم تینوں کو بلایا ہے۔ ان کی حکم عدولی میں کیسے کر سکتا ہوں۔" فاروق شوخ انداز میں مسکرایا۔

"تو پھر بیٹھے رہو چپ چاپ۔" محمود بولا۔

"کیوں۔ کیا ٹیکسی میں بولنا منع ہے۔ کہیں لکھا ہوا تو نظر نہیں آ رہا۔"

"تو یہ ہے۔" محمود نے اپنی ران پر ہاتھ مار کر کہا۔

"کس سے توبہ ہے۔ تم نے آگے کچھ نہیں کہا۔"

"کان نہ کھاؤ یار۔ جب بھی ہم کوئی کام کی بات کرنے لگتے ہیں، تمہاری زبان کی بیچ میں ٹانگ اڑجاتی ہے" محمود کو غصہ آتا جا رہا تھا۔

"لو۔ اب میری زبان کی ٹانگ بھی نکل آئی یار محمود۔۔۔ کبھی تو سوچ سمجھ کر منہ سے بات نکال لیا کرو۔"

"یہ کام تم جو کرتے رہتے ہو" فرزانہ جھلا اٹھی۔

"ارے ارے۔ ٹیکسی میں جھلانا بڑی بات ہے" فاروق نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"کک۔۔۔ کیا مطلب۔" فرزانہ بوکھلا اٹھی۔

"چھوڑو فرزانہ کس کی باتوں میں آ رہی ہو" محمود نے کہا۔

"فاروق کی" فاروق جھٹ بولا۔

"اب ہم اس وقت تک کوئی بات نہیں کریں گے جب تک ٹیکسی سے نہ اتر جائیں" محمود نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"میں سمجھ گیا۔۔۔ اس کا مطلب ہے، اب میں اس وقت تک نہ بولوں جب تک۔۔۔"

اسی وقت ٹیکسی نے ایک موڑ کاٹا اور دوسرے ہی لمحے وہ آئی جی صاحب کی کوٹھی کے سامنے کھڑے تھے۔ کوٹھی سڑک سے ہٹ کر ایک چوڑی گلی میں تھی اور بہت خوبصورت تھی۔ تینوں نیچے اتر آئے۔ انہوں نے ٹیکسی کا بل ادا کیا اور کوٹھی کے دروازے

کی طرف بڑھے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ کوٹھی کے دروازے پر ایک مشین گن دانفل لیے کانسٹیبل موجود تھا۔ انہیں اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اس نے پوچھا:

"آپ کے نام؟"

"محمود، فاروق اور فرزانہ" محمود نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ اندر جا سکتے ہیں۔"

انہوں نے ایک دوسرے کو حیرت زدہ انداز میں دیکھا اور اندر داخل ہو گئے۔

"معاملہ تو کچھ زیادہ ہی گہرا معلوم ہوتا ہے" فاروق نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"اب ہوش آیا۔۔۔ ہم ٹیکسی میں اس بات پر غور کرنا چاہتے تھے۔۔۔ مگر تمہاری زبان کچھ کرنے بھی دے" فرزانہ نے جھنجھلا کر کہا۔

"آئی ایم سوری۔ مجھے ہرگز یہ احساس نہیں تھا کہ معاملہ اس قدر سنجیدہ بھی ہو سکتا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں ابا جان تک پہنچنے سے پہلے سوچ لیتے ہیں" یہ کہتے وقت بھی فاروق مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"جی ہاں۔ ابا جان ہم سے دو میل دور تو ضرور ہوں گے نا" محمود بولا۔

"اچھا بھائی۔ معاف کر دو۔"

وہ برآمدہ عبور کرتے ہوئے گھر کے صحن میں آ گئے۔ یہاں بھی ایک کانسٹیبل موجود تھا۔ اس نے انہیں بتایا کہ انسپکٹر جمشید اور باقی لوگ

کس طرف ہیں۔ وہ تیزی سے اس طرف بڑھے۔ پھر وہ اس کمرے کے سامنے پہنچ گئے اور ٹھٹھک کر رک گئے۔

•

محمود، فاروق اور فرزانہ کو الگ کرنے کے بعد انھوں نے اکرام اور چند اور پولیس کے آدمیوں کو فون کیا... آئی جی صاحب کی کوٹھی کو پولیس کے گھیرے میں لینے کی ہدایات دیں اور جب وہ ریسیور رکھ کر مڑے تو آئی جی صاحب پریشان نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے جمشید۔"

"جتنی حیرت آپ کو ہے، اسی قدر حیرت مجھے بھی ہے۔"

"کیا ہم کسی چکر میں پڑنے والے ہیں۔"

"بڑے چکر میں کہیے۔" انسپکٹر جمشید فکر مند آواز میں بولے۔

"اُف خدا۔ مجھے کس قدر خوف محسوس ہو رہا ہے۔ آخر اب تم کرو گے کیا۔"

"جن لوگوں کو میں نے فون کیا ہے وہ لوگ ذرا آ لیں... ایک بار کوٹھی پولیس کے گھیرے میں آ جائے... پھر اطمینان سے کام کیا جا سکے گا۔ میں سوچ رہا ہوں، کہ آئندہ چند لمحوں یا گھنٹوں میں کچھ اور غیر یقینی حالات پیش آنے والے ہیں۔"

"خدا خیر کرے جمشید میں نے تمہیں اتنا سنجیدہ کبھی نہیں دیکھا۔ کیا میری کوٹھی اور گھر کے افراد کسی مصیبت کا شکار ہونے والے ہیں۔" انھوں نے پریشان ہو کر کہا۔

"جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ لیکن خطرہ اس سے بھی بڑا ہے... مجھے ڈر ہے کہ یہ معاملہ پورے ملک کا معاملہ ثابت نہ ہو۔" انسپکٹر جمشید کی آواز بھنچی تھی۔

"اوہ!" آئی جی صاحب کی آنکھیں مارے خوف کے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

جلد ہی اکرام اور پولیس کے کچھ دوسرے افسران چند کانسٹیبلوں کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ کوٹھی کے دونوں دروازوں پر کانسٹیبل کھڑے کر دیے گئے۔ اکرام کو چکر لگاتے رہنے کی ہدایت کی گئی۔ وہ سب انتہائی حیران تھے کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ آخر ایک آفیسر سے رہا نہ گیا۔

"آخر معاملہ کیا ہے جناب؟"

آفیسر نے یہ جملہ آئی جی صاحب سے پوچھا تھا — اس کا نام انور علی سیٹھی تھا اور پولیس کے محکمے میں سپرنٹنڈنٹ تھا۔

"انسپکٹر جمشید ہی کچھ بتا سکیں گے۔" آئی جی بولے۔ انور علی سیٹھی اب ان کی طرف مڑے۔

"انسپکٹر صاحب۔ چلیے آپ ہی بتا دیں۔" اس نے جلے بھنے لہجے میں کہا۔ وہ انسپکٹر جمشید اور اس کی شہرت سے جلتا تھا۔

"بات صرف یہ ہے کہ صاحب کے ہاں ان دنوں ایک مہمان ٹھہرا ہوا تھا۔۔۔ وہ گھر سے اچانک اور پُراسرار طور پر غائب ہو گیا ہے۔"

"غائب ہو گیا ہے کیا مطلب؟"

"بس صبح وہ اپنے کمرے میں نہیں ملا۔۔"

"تو پھر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟" انور علی سیٹھی نے مذاق اُڑانے والے لہجے میں کہا۔ "اسے اچانک کوئی کام آ پڑا ہو گا اور وہ چلا گیا ہو گا۔"

"اس صورت اسے اطلاع دے کر جانا چاہیے تھا، کم از کم وہ ایک رقعہ ضرور چھوڑ کر جا سکتا تھا۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ہوں۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ یہ معاملہ اس قدر بڑا تو نہیں ہو سکتا۔"

"بڑا ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ آپ ہی ذرا اس کمرے کا جائزہ لے لیں۔۔۔ آپ کی معلومات کے لیے بتائے دیتا ہوں کہ مہمان پلاسٹک کا ایک بیگ لے کر آیا تھا اور اس میں صرف دو جوڑے تھے۔ تیسرا وہ پہنے ہوئے تھا۔۔۔ اور یہ کہ وہ جوتے پہن کر آیا تھا۔ اب آپ کمرے کو غور سے دیکھ لیں تاکہ آپ بھی کسی نتیجے پر پہنچ سکیں گے۔ اس کے بعد ہم کوئی قدم اٹھائیں گے۔"

"اچھی بات ہے۔"

انور علی سیٹھی نے اپنے اسسٹنٹ کو ساتھ لیا اور کمرے کی

ایک ایک چیز کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے الماری کھول کر مہمان کے کپڑے اور بیگ بھی دیکھا۔ چارپائی کے نیچے اسے مہمان کے جوتے پڑے نظر آئے۔ اس کے بعد اس نے غسل خانے کا جائزہ لیا۔۔۔ لیکن یہاں بھی اسے کوئی خاص بات نظر نہ آئی اس نے واپس آتے ہوئے کہا:

"مجھے تو کوئی عجیب و غریب بات نظر نہیں آئی۔ یہ ایک عام سا واقعہ ہے۔۔۔ مہمان کو افراتفری کے عالم میں جانا پڑا ہے۔ اس لیے وہ جوتے بھی نہیں پہن سکا اور چپل پہنے ہوئے ہی نکل گیا۔"

"شاید آپ کا ہی خیال درست ہو، لیکن شاید آپ نے غسل خانہ اچھی طرح نہیں دیکھا۔"

"میں خوب غور سے جائزہ لے چکا ہوں۔" انور علی سیٹھی نے منہ بنا کر کہا۔

اسی وقت انسپکٹر جمشید نے محمود کی آواز سنی:

"ابا جان! ہم آ گئے ہیں۔"

انہوں نے چونک کر دیکھا۔ تینوں اندر داخل ہو رہے تھے۔

انہوں نے مسکرا کر کہا:

"بہت خوب۔۔۔ تمہیں یہ تو معلوم ہی ہے، یہاں سے ایک مہمان غائب ہو گئے ہیں۔۔۔ اب سنو۔۔۔ وہ ایک پلاسٹک کا بیگ لے کر آئے تھے۔۔۔ اس میں صرف دو جوڑے کپڑے تھے اور جوتے

چھپے ہوئے تھے... اب ذرا جلدی سے کمرے کا جائزہ لے کر بتاؤ کہ مہمان کب اور کیسے گیا؟"

"جی بہت اچھا۔" محمود نے سعادت مندانہ لہجے میں کہا اور پھر کمرے کی ایک ایک چیز کو آگے بڑھ کر غور سے دیکھنے لگے۔ انور علی سیٹھی اور اس کا اسسٹنٹ انہیں پریشان نظروں سے دیکھ رہے۔ وہ تینوں اب غسل خانے کی طرف جا رہے تھے اور پھر جب وہ غسل خانے سے باہر نکلے تو مارے حیرت کے ان کا برا حال تھا۔ محمود نے کہا:

"ابا جان... مہمان اس کمرے سے کہیں نہیں گئے۔"

پروفیسر بھی غائب

محمود کا جملہ سن کر انور علی سیٹھی اور اس کا اسسٹنٹ ہنس پڑے۔

"بھئی کتنا زبردست اندازہ لگایا ہے آپ کے بچوں نے۔" انور علی سیٹھی نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

"اب ان سے کہیے، یہ بھی بتا دیں کہ اگر مہمان کمرے سے کہیں نہیں گیا تو پھر کہاں ہے اور ہم سب یہاں کس سلسلے میں جمع ہیں۔" اس کے اسسٹنٹ نے کہا۔

"ہم مہمان کی گمشدگی کے سلسلے میں ہی یہاں جمع ہوئے ہیں... لیکن کمرے کے جائزے کے بعد جو حقیقت سامنے آئی ہے وہ یہی ہے کہ مہمان کو اس کمرے سے باہر قدم رکھنا ہی نصیب نہیں ہوا۔" فاروق نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"یہ ایک بہت عجیب بات ہے... ہم جانتے ہیں کہ مہمان کمرے میں نہیں ہے، اس کے باوجود تم لوگ یہ کہنے پر اصرار کر رہے ہو کہ مہمان باہر نہیں گیا۔" انور علی سیٹھی نے کہا۔

"جی ہاں... اور ہم اس بات کو ثابت کر سکتے ہیں۔" فرزانہ نے مسکرا کر کہا۔

"ضرور ضرور— ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ کوئی بات ثابت ہو جائے"

"تو پھر سنیے... مہمان کے بیگ میں سے دو جوڑے نکلے تھے دونوں جوڑے الماری میں موجود ہیں۔ ان کے جوتے بھی پلنگ کے نیچے موجود ہیں.... اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک جوڑا وہ پہنے ہوئے بھی تھے، لیکن وہ جوڑا اب غسل خانے میں موجود ہے... اور وہاں.. فرش پر ایک چپل بھی پڑی ہے— تو پھر.... کیا مہمان بغیر چپل کے اور کپڑوں کے... یہاں سے گئے ہیں۔" یہ کہہ کر محمود خاموش ہو گیا۔ انور علی سیٹھی اور دوسرے حیرت زدہ رہ گئے... اسی وقت فرزانہ نے کہا:

"انکل ذرا اپنے ملازم کو تو بلائیے۔"

آئی جی صاحب نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور پھر ملازم کو بلانے کے لیے پلنگ کے پائے پر لگی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ فوراً ہی ملازم اندر داخل ہوا۔ فرزانہ نے اس سے کہا:

"آج صبح گھر کا دروازہ بند ملا تھا یا کھلا؟"

"جی— دروازہ بند ملا تھا— ہر روز کی طرح... آج بھی میں نے ہی کھولا تھا۔" اس نے کہا... محمود، فاروق اور فرزانہ کے چہروں پر مسکراہٹیں پھیل گئیں۔

"اوہ—" انور سیٹھی کے منہ سے نکلا۔

"اور جب آپ مہمان کو بلانے آئے تو اس کمرے کا دروازہ بھی کھلا

نہیں نکلی۔" فرزانہ نے بتایا۔

"کیوں امی جان؟" فاروق بیگم جمشید کی طرف مڑا۔

"یہ بالکل ٹھیک ہے— فرزانہ تمام وقت میرے ساتھ رہی ہے۔"

"تو پھر تم ضرور جادوگر ہو— آخر تمہیں کس طرح معلوم ہوا کہ میں نے بڑ کے درخت کا پتا توڑا تھا۔" محمود نے کہا۔

"مجھے یقین ہے— کیا تم انکار کرتے ہو۔" فرزانہ نے مسکرا کر کہا۔

"اگر میں یہ کہوں کہ پتا محمود نے نہیں... میں نے توڑا تھا۔" فاروق نے کہا۔

"غلط— پتا محمود نے توڑا تھا— تم تو درخت کے قریب بھی نہیں گئے تھے۔" فرزانہ بدستور مسکرا رہی تھی۔

"حیرت ہے— آخر یہ باتیں تم اتنے یقین سے کس طرح کہہ رہی ہو۔" محمود نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔

"یہ کچھ مشکل نہیں— انسان کا مشاہدہ تیز ہو تو ایسی باتیں خود بخود معلوم ہو جاتی ہیں— تمہارے دائیں کندھے کے اوپر دودھ کا ایک قطرہ گر کر جم گیا ہے جمنے کے بعد اس کا رنگ سیاہی مائل ہو گیا ہے..... اور کپڑا تھوڑا سا سکڑ گیا ہے— یہ بڑ کے دودھ کی خاصیت ہے۔ اگر تم نے پتا نہیں توڑا تو دودھ کا قطرہ کہاں سے گر گیا ہے اور چونکہ فاروق کے کپڑوں پر کوئی دھبہ نہیں ہے۔ اس لیے یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ درخت کے قریب بھی نہیں گیا۔ اب کہو— کیا کہتے ہو۔"

"خدا کی پناہ— تم لڑکی نہیں... جن ہو۔" فاروق نے آنکھیں نکالیں۔

"اگر میں جاسوس ہوں تو تم دونوں میرے بھائی ہو — میں تو یہ بھی بتا سکتی ہوں کہ دو دن پہلے کسی گندی نالی کے کنارے کھڑا تھا اور محمود تم اس نالی پر جھکے ہوئے تھے...... شاید نالی میں سے کچھ اٹھا رہے تھے...... دو دن — اب میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تم نے بڑ کے درخت کا پتا نالی میں سے کوئی چیز اٹھانے کے لیے توڑا تھا — اب ذرا جلدی سے بتا دو، تم نے نالی میں سے کیا اٹھایا تھا۔"

صرف محمود اور فاروق ...... بلکہ بیگم جمشید بھی ہکا بکا فرزانہ کو گھور رہی تھیں۔

*

لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ یہ نہ جان سکے کہ چیخ کی آواز کہاں سے آئی تھی اور کون چیخا تھا۔ آخر وہ سوچ میں گم واپس بخاری صاحب اور مرزا شہباز بیگ کے پاس آ گئے۔

"کہیں انسپکٹر صاحب — کیا خیال ہے — فیروز کو وہم ہی ہوا ہے نا؟" مرزا صاحب نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے اسے وہم نہیں ہوا۔"

"کیا مطلب؟" مرزا صاحب چونکے۔

"چیخ کی آواز خود میں نے بھی سنی ہے۔"

"اوہ — یہ تو عجیب بات ہوئی ...... چیخ کی آواز تو میں نے بھی بہت

دفعہ سنی ہے — اور یہ ضرور کوئی شرارت کرتا ہے ...... جب کہ فیروز کا خیال ہے کہ اس کمرے میں کوئی بھوت آ گھسا ہے۔"

"اگر وہ کوئی بھوت ہے تو پھر میں کہوں گا کہ وہ کوئی بہت ہی مصیبت زدہ بھوت ہے، کیونکہ مجھے چیخ کی آواز سے بے پناہ تکلیف اور گھبراہٹ کا احساس ہوا تھا۔" انہوں نے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے ...... آپ بھی فیروز کی باتوں میں آ گئے۔"

"فیروز نے تو مجھ سے کوئی بات کی ہی نہیں — خیر چھوڑیے اس قصے کو — ہاں تو آپ فکر نہ کریں......"

"میں بہت جلد اس کھنڈر کا معائنہ کروں گا اور دیوار پر لکھی تحریر کا بھی جائزہ لوں گا — اس کے بعد میں جس نتیجے پر بھی پہنچا، آپ کو بتا دوں گا۔"

"بہت بہت شکریہ — میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" بخاری صاحب نے خوش ہو کر کہا۔

"تو اب میں چلتا ہوں۔"

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے چہرے پر گہری سوچ کے آثار تھے۔ الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ گھر سے نکل کر اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر روانہ ہوئے ...... لیکن سو گز بھی نہ گئے ہوں گے کہ سڑک کے کنارے انہیں فیروز کھڑا نظر آیا۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے انہیں رکنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ انہوں نے بریک لگائی اور اس کے قریب رک گئے۔

"میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں جناب!"

"کیا بات ہے فیروز؟"

"جناب میں جانتا ہوں، آپ محکمہ سراغرسانی کے انسپکٹر ہیں... اس لئے میں نے گھر سے کچھ فاصلے پر آکر آپ کا راستہ روکا ہے... میں اس گھر میں بہت عرصے سے ملازم ہوں، یہ گھٹی گھٹی چیخیں سنتا آرہا ہوں۔ میں نے بار بار مرزا صاحب سے ذکر کیا، مگر وہ ہنس پڑتے ہیں... کہتے ہیں مجھے وہم ہو گیا ہے... لیکن یقین جانئے... یہ وہم نہیں ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو فیروز... میرا بھی یہی خیال ہے کہ یہ وہم نہیں ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"خدا آپ کا بھلا کرے... میں غریب آدمی ہوں، ملازمت چھن جانے کے ڈر سے کچھ نہیں کہتا... ورنہ سچ تو یہ ہے کہ..." وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کی آنکھوں میں خوف سمٹ آیا۔ اس کی نظریں مرزا شہباز بیگ کے گھر کی طرف اٹھ گئی تھیں۔

"کیا بات ہے... تم کہتے کہتے رک کیوں گئے؟"

"وہ آرہے ہیں۔ انہوں نے مجھے آپ سے باتیں کرتے دیکھ لیا ہے۔"

"کون؟" انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

"مرزا صاحب..."

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

اسی وقت مرزا شہباز بیگ وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے کہا۔

"فیروز... کیا بات ہے... تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟"

"جی... جی... کچھ نہیں۔" فیروز ہکلایا۔

"یہ مجھے اس چیخ کے بارے میں بتا رہے تھے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ "خیر، اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ انہیں ضرور وہم ہو گیا ہے۔"

یہ کہتے ہی انہوں نے موٹر سائیکل آگے بڑھا دی۔ فیروز اور مرزا شہباز بیگ سڑک کے کنارے کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

دو پارٹیاں

وہ چند لمحے تک فرزانہ کو گھورتے رہے۔ آخر محمود نے کہا۔

"پہلے یہ بتاؤ... تم نے یہ سب اندازے کس طرح لگا لیے۔"

"تمہارے دائیں جوتے کی نوک پر سبز رنگ کی کائی لگی ہے... جو عام طور پر گندے نالوں کے کناروں پر موجود ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ تم نالی پر جھکے تھے... برش کے پیٹے کو سامنے رکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ تم نے اسی کی مدد سے نالی سے کچھ نکالا تھا۔"

"معقول۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ فاروق... یہ شیطان کی خالہ ہے۔" محمود نے لمبا سانس بھر کر کہا۔

"اچھا۔ مجھے آج ہی معلوم ہوا۔" فاروق نے حیرت ظاہر کی۔

"کیا کہا۔ میں شیطان کی خالہ ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم مجھے جن کہہ رہے تھے۔ آخر میں کیا کیا ہوں۔ اور پھر میں شیطان کی خالہ ہوں تو تم شیطان کے خالو بھی ضرور ہو گے۔" فرزانہ غصے کے عالم میں کہتی چلی گئی۔

"چلو مان لیتے ہیں۔" فاروق مسکرایا۔

"تو پھر سیدھی طرح بتاؤ۔ تم نے اس نالی میں سے کیا اٹھایا تھا؟"

"کیپسول۔" محمود ترنت سے بولا، کیونکہ اب چھپانا مشکل تھا۔

"کیپسول۔ کیا مطلب؟" فرزانہ بولی۔

"تم کیپسول کا مطلب بھی نہیں سمجھتیں۔" فاروق جھلا اٹھا۔

"کیپسول کا مطلب تو اچھی طرح جانتی ہوں۔ سوال تو یہ ہے کہ ایک گندی نالی میں سے کیپسول اٹھانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی۔"

"وہ پندرہ بیس کیپسول تھے۔ یہ وہاں بلاوجہ نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے ہم نے سوچا دیکھنا چاہیے... یہ یہاں کیوں تیر رہے ہیں۔"

"تو پھر۔ کیا تم نے دیکھ لیا۔" فرزانہ نے پوچھا۔

"نہیں! ابھی ہم نے کیپسول نکال کر نالی کے پانی سے پاک کیے ہی تھے کہ ایک لمبا تڑنگا نوجوان آ دھمکا اور چھیننے لگا۔ یہ کیپسول اسی کے ہیں، اسی سے نالی میں گر گئے تھے۔"

"اور وہ تم نے اسے دے دیے۔" فرزانہ پھاڑ کھانے والے انداز میں بولی۔

"تو اور کیا کرتے۔" محمود بولا

"بے وقوف ہو تم۔"

"اچھا۔ کیا یہ بالکل نئی اطلاع ہے۔" فاروق چہکا۔

"ہمیں کم از کم ان میں سے ایک آدھ کیپسول اس کی نظر بچا کر رکھ لینا چاہیے تھا۔" فرزانہ نے کہا۔

"اب ہمارے پاس تم جتنا تیز دماغ تو ہے نہیں، نہ ہم اتنی تیزی سے نئی نئی سوچ سکتے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ تھیں بھی نہیں ۔۔۔ پھر بھلا ہم ایک کیپسول کیسے رکھ لیتے؟"

"لاحول ولا قوۃ ۔۔۔" فرزانہ نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

محمود نے فاروق کی طرف اور فاروق نے محمود کی طرف دیکھا ۔۔۔ بات بیچ میں رہ گئی تھی۔

انہوں نے جلدی جلدی چائے پی اور اپنے کمرے میں آ گئے۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"اب نکالو وہ کیپسول ۔۔۔ خدا کا شکر ہے ۔۔۔ اس شیطان کی خالہ سے صاف چھپا رہ گیا۔"

"ہاں ۔۔۔ ورنہ وہ تو ہمارے کان کاٹ گئی تھی۔" محمود نے کہا اور جیب سے کیپسول نکال کر اسے کھولنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے وہ حیرت کے مارے اچھل پڑے۔ کیپسول میں ایک بہت ہی باریک کاغذ ٹھنسا ہوا تھا۔ محمود نے کاغذ نکالا اور اسے سیدھا کرنے لگا۔ اب دونوں پر جوش کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ کاغذ سیدھا ہوتے ہی وہ چونک اٹھے۔ اس پر چند جملے لکھے تھے۔ ابھی انہوں نے پڑھنا شروع کیا ہی تھا کہ باہر سے آواز آئی۔

"کیا اکیلے اکیلے ہی پڑھو گے؟"

اور وہ جھلا اٹھے۔ وہ سمجھے تھے کہ فرزانہ کو چکمہ دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ مگر وہ بہت ہوشیار ثابت ہوئی۔ محمود نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

"تم نے چائے بہت جلدی جلدی پی تھی۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ تم دونوں کمرے میں جا کر کچھ کرنا چاہتے ہو ۔۔۔ چنانچہ میں دیکھنے چلی آئی۔ تالے کے سوراخ میں سے میں نے دیکھا کہ کیپسول میں سے ایک کاغذ نکلا ہے ۔۔۔ بس میں رہ نہ سکی۔ اب کاغذ ہم تینوں پڑھیں گے۔" وہ شوخ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"اچھا بابا۔"

تینوں کاغذ پر جھک گئے۔ لکھا تھا۔

"میں یہاں نہ جانے کتنے سالوں سے قید ہوں۔
کیا کوئی خدا کا بندہ ایسا نہیں، جو مجھے اس
قید سے نجات دلا دے۔
ایک مظلوم عورت۔"

خط پڑھ کر انہوں نے سر اٹھایا ہی تھا کہ [illegible]ے کی گھنٹی بجی۔ وہ چونک اٹھے۔

*

بیگم جمشید نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ انسپکٹر جمشید مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے۔

"دعوت میں بہت دیر لگا دی آپ نے۔" بیگم جمشید بولیں۔

"دعوت تو بہت دیر پہلے ختم ہو گئی تھی، میں وہاں ایک ضروری کام سے رک گیا تھا، بچے کہاں ہیں؟"

"باتیں باغ والے کر رہے ہیں۔"

"کیوں — کیا کوئی میٹنگ کر رہے ہیں۔"

"ہاں شاید — محمود اور فاروق ابھی ابھی واپس آئے تھے۔"

یہ کہتے ہوئے انہوں نے کیپسول والا واقعہ انہیں بتایا۔ اسی وقت تینوں کمرے سے نکل کر آ گئے۔

"اسلام علیکم ——"

"وعلیکم اسلام — کہاں ہے وہ کیپسول۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ہم ایک کیپسول چرا لائے ہیں۔"

"تم اتنے بے وقوف نہیں ہو کہ تم فرزانہ کو چلا دینے کے لئے ایسا کیا ہو گا۔"

"بالکل ٹھیک ابا جان اگر میں ان کے چکر میں آنے والی نہیں۔" فرزانہ نے ہنس کر کہا۔

"یہ لیجئے ابا جان — اس کیپسول میں سے یہ کاغذ نکلا ہے۔"

انہوں نے کاغذ لے کر پڑھا اور سوچ میں ڈوب کر رہ گئے۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ۔"

"میں سوچ رہا ہوں — ایک ہی دن میں کتنی عجیب باتیں سامنے آئی ہیں۔"

"کیا مطلب — کیا آپ کے ساتھ بھی کوئی واقعہ پیش آیا ہے۔" محمود نے چونک کر کہا۔

"نہیں — واقعہ تو کوئی پیش نہیں آیا... البتہ ایک کیس میرے علم میں آیا ہے"

تمہیں بھی بتاتا ہوں... آؤ بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

وہ صحن میں ہی بیٹھ گئے۔ بیگم جمشید رات کے کھانے کی تیاری کے سلسلے میں باورچی خانے میں چلی گئیں۔ اب انسپکٹر جمشید نے انہیں وہ تمام باتیں بتائیں جو بخاری صاحب نے بتائی تھیں۔ مرزا شہباز بیگ کے مکان میں جو گھنٹی بجتی سنی تھی — اس کے بارے میں بھی بتایا۔

وہ سوچ میں گم ہو گئے — آخر فاروق نے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں بیک وقت دو معاملوں پر غور کرنا ہے۔"

"بالکل ٹھیک... تو کیوں نہ ہم دو پارٹیاں بنا لیں — ایک کیس پر پارٹی کام کرے اور دوسرے کیس پر دوسری پارٹی۔" فرزانہ نے نئی تجویز پیش کی۔

"کیا مطلب" انسپکٹر جمشید چونکے۔ فرزانہ مسکرائی اور بولی۔

"کیپسول محمود اور فاروق کو ملا ہے، لہٰذا اس معاملے کو ان دونوں کے سپرد کر دیں — یہ خود ہی سراغ لگا لیں گے کہ وہ قیدی کون ہے اور کہاں قید ہے... دوسری طرف یعنی قصبہ فیروز خان والا معاملہ ہے، وہاں آپ اور میں چلتے ہیں۔" فرزانہ نے تفصیل بیان کی۔

"بات تو معقول ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے "کیوں بھئی — کیا تم دونوں کو منظور ہے؟"

"تو ابا جان — ہم باری باری کیوں نہ دونوں کیسوں پر کام کریں... یعنی پارٹیاں پہلے ایک کیس پر اور پھر دوسرے پر۔"

"اس طرح ایک کیس لیٹ ہو جائے گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"بھئی یوں ہی سہی — ہم دونوں بھی اس نالی کے ذریعے اس عمارت میں
پہنچنے کی کوشش کریں گے جس میں سے کیپسول بہائے گئے ہیں۔"

"لیکن وہ دبا تو آخر کون کرتا تھا؟" فرزانہ نے سوال کیا۔

"وہ ضرور اس شخص کا ملازم ہوگا...... جس نے اس نامعلوم عورت کو قید کیا
ہے۔" فاروق نے خیال ظاہر کیا۔

"اور اس نے ہمیں نالی میں سے کیپسول نکالتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا، فوراً ہی
معاملے کو بھانپ گیا ہوگا اور وہاں آگیا ہوگا تاکہ ہم اصل معاملے کی تہ تک نہ
پہنچ سکیں۔"

"اب یہ اور بات ہے کہ ہم تہ تک پہنچ گئے ہیں۔" فاروق مسکرایا۔

"ابھی کہاں — ابھی تو منزل بہت دور ہے۔" فرزانہ نے کہا۔

"خیر...... دیکھا جائے گا کہ کس کی منزل دور ہے۔"
محمود نے کہا۔

"بہر حال بات طے رہی — کل سے دونوں پارٹیاں الگ الگ کام
کریں گی۔" انسپکٹر جمشید نے گویا اعلان کیا۔ اس وقت بیگم جمشید کسی کام سے
باورچی خانے سے باہر نکلیں۔ انہوں نے ان کا جملہ سن لیا، بولیں۔

"یہ کن پارٹیوں کا ذکر ہو رہا ہے؟"

"امی جان! ہم چاروں دو پارٹیوں میں بٹ گئے ہیں۔" محمود نے
کیا مطلب؟" بیگم جمشید چونکیں۔

"مطلب یہ کہ میں اور فاروق مل کر ایک پارٹی بن گئے ہیں اور ابا جان اور
فرزانہ دوسری پارٹی۔"

"تو کیا میں اس گھر میں چھپی رہتی۔" بیگم جمشید نے جھلا کر کہا۔

ان کی اس بات پر ایک زوردار قہقہہ لگا۔

سونے کی انگوٹھی

دوسرے دن شام کو دونوں پارٹیاں گھر سے الگ الگ روانہ ہوئیں۔
محمود اور فاروق اس جگہ پہنچے جہاں انہوں نے کیپسول پائے تھے۔ آج
یہاں کوئی کیپسول نہیں تھا۔ وہ نال کے ذریعے چلتے چلتے ایک بہت بڑی
مگر عظیم الشان عمارت کے سامنے پہنچ گئے دور سے یہ عمارت ایک محل
محل نظر آتی تھی۔ دروازہ کیا تھا،
ایک بہت بڑا پھاٹک تھا جس میں لوہے کی بڑی بڑی میخیں ابھری ہوئی
گل تھیں۔ دونوں نے ایک پل کے لئے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور
آگے بڑھے۔ دروازے پر گھنٹی کا بٹن موجود تھا۔

"کیا خیال ہے — کیا گھنٹی بجا دوں"، فاروق نے پوچھا۔

"اور ہم یہاں کس لئے آئے ہیں — یاد رکھو..... ہم فرزانہ کو اپنا
کا موقع ہرگز نہیں دیں گے"، محمود نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"بالکل ٹھیک — ایسا ہی ہوگا۔"

فاروق نے کہا اور گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ جواب میں انہیں
آواز سنائی نہ دی — دروازے پر کسی کے نام کی تختی بھی نہیں تھی اور

ری اور مکان نمبر بھی نہ تھا۔

"یہ گھنٹی تو خراب معلوم ہوتی ہے"، فاروق بولا۔

"نہیں — شاید گھنٹی بہت دور کہیں لگی ہے۔ اس لئے ہم تک آواز نہیں
پہنچی۔"

اچانک وہ چونک اٹھے۔ اندر قدموں کی آواز ابھری تھی۔ آواز آہستہ آہستہ
قریب آتی چلی گئی۔ آخر دروازہ ایک تیز چڑچڑاہٹ سے کھلا۔ ان کے سامنے
سفید داڑھی والا ایک بوڑھا کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں پر عینک تھی اور ہاتھوں
اور چہروں پر بے شمار جھریاں۔

"کیا بات ہے بیٹا؟" اس نے پوچھا۔

"جناب اس گھر کے مالک سے ملنا ہے۔"

"کیا کہا — تم نواب سرفراز عالم سے ملنا چاہتے ہو —؟" بوڑھے نے
حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"تو .... تو کیا یہاں نواب سرفراز عالم صاحب رہتے ہیں؟" محمود کے منہ
سے نکلا۔ دونوں کے چہروں پر بلا کی حیرت تھی۔

نواب سرفراز عالم کو کون نہیں جانتا تھا — وہ اس ملک کی بہت مشہور
ہستی تھے — ملک کے وزیر اعظم سے ان کے خاص تعلقات تھے — جدی پشتی
نواب تھے.... دولت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان
کے پاس کس قدر دولت ہے — حکومت کی امداد کے لئے لاکھوں روپے ماہانہ
دیتے تھے۔ غریبوں اور بیواؤں وغیرہ کے لئے شہر میں یتیم خانے اور مسافر خانے

ٹکرا رہے تھے۔ جہاں سے ہر کسی کو ہر وقت مدد ملتی تھی۔ ان کی سخاوت اور فیاضی کا دور دور تک شہرہ تھا۔ ان کی رحم دلی کی بے شمار کہانیاں مشہور تھیں اور آج محمود اور فاروق ایک اتفاق کی وجہ سے ان کی حویلی تک پہنچ گئے تھے۔ وہ چونک اٹھے۔ بوڑھا کہہ رہا تھا۔

"ہاں۔ یہ ان کا دورے کا وقت ہے۔ وہ وقت دیئے بغیر کسی سے نہیں ملتے مگر تم یہ تو بتاؤ ان سے کیوں ملنا چاہتے ہو۔"

"یہ ہم انہی کو بتا سکتے ہیں۔"

"خیر۔ میں ان کے سیکرٹری سے آپ کو ملوائے دیتا ہوں۔ وہ آپ کو ملاقات کا وقت دے دیں گے۔"

"اچھی بات ہے۔"

وہ بوڑھے کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ دروازے سے گزر کر وہ ایک پختہ چھوٹی سڑک پر چلتے ہوئے حویلی کے اندرونی حصے میں داخل ہوئے۔ بوڑھا انہیں ایک کمرے میں لے کر داخل ہوا۔

"آپ دونوں یہاں بیٹھیں۔ میں سیکرٹری صاحب کو اطلاع کرتا ہوں۔"

"جی اچھا۔" محمود نے کہا۔

بوڑھا چلا گیا۔ دونوں نے ڈرائنگ روم پر ایک نظر ڈالی۔ ہر چیز شاہانہ انداز کی تھی۔ صوفے اتنے آرام دہ کہ آدمی ان میں دھنستا چلا جائے۔ دیواروں پر سنہری فریم کی بڑی بڑی تصاویر لگی تھیں۔ یہ تصاویر شاید نواب

دیکھ لگے۔ جلدی کیجئے۔"

عورت دوڑتی ہوئی فون کی طرف گئی۔ فون اسی کمرے میں تپائی پر رکھا ہوا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کے نمبر ڈائل کیے۔ باقی کھڑے اس کی طرف دیکھتے رہے۔

"ہیلو ڈاکٹر... جی... کیا فرمایا آپ نے؟"

ایک بار پھر عورت کی آنکھیں مارے حیرت کے پھیل گئیں اور اس مرتبہ صرف وہی نہیں، انسپکٹر جمشید اور ان کے ساتھی بھی حیرت زدہ رہ گئے کیونکہ عورت نے صرف ڈاکٹر کو فون کیا تھا اور ہیلو ڈاکٹر ہی کہا تھا۔ پھر بھلا اس کی آنکھیں حیرت سے کیوں پھیل گئیں۔ یہ کچھ کم حیرت انگیز بات نہیں تھی۔

دوسری طرف عورت کا رنگ اڑتا جا رہا تھا۔ آخر اس نے ریسیور سے منہ ہٹا کر ان کی طرف حیرت بھری نظروں سے دیکھا اور بولی۔

"کیا آپ میں سے کوئی انسپکٹر جمشید بھی ہے؟"

اور انہیں ایک زوردار جھٹکا لگا۔

دھواں بن گیا

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید کی زندگی میں نہ جانے کتنے حیرت انگیز ترین لمحات آئے تھے، لیکن یہ لمحہ عجیب تھا... ایک اجنبی شہر میں وہ ایک شخص سے ملنے آئے تھے۔ اس کا جسم برف سے بھی زیادہ سرد ملا تھا اور انسپکٹر جمشید نے گھر کے ایک فرد کو ڈاکٹر کو فون کرنے کے لیے کہا تو اس نے ڈاکٹر کے نمبر ملائے... پھر فون کرنے والا حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے ان کی طرف پریشان ہو کر دیکھا تھا اور اس کے بعد پوچھا تھا... کیا آپ میں سے کوئی انسپکٹر جمشید بھی ہے۔

چند لمحے تک وہ پتھر کے بتوں کی طرح کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ آخر انسپکٹر جمشید نے بوکھلا کر کہا:

"ہاں کیوں — کیا بات ہے — میرا نام انسپکٹر جمشید ہے... مگر آپ نے تو ڈاکٹر کو فون کیا تھا؟"

"بے شک میں نے ڈاکٹر کو فون کیا تھا... ڈاکٹر شیفرڈ ہمارے بہت پرانے خاندانی ڈاکٹر ہیں... انھوں نے دوسری طرف سے ہیلو بھی کہا تھا، لیکن پھر فون میں ایک تیسری آواز سنائی دی...

اس آواز نے کہا... محترمہ آپ کے پاس اس وقت انسپکٹر جمشید موجود ہیں... ریسیور انھیں دے دیں۔" یہ کہہ کر... بیگم شاہد خاموش ہو گئیں۔

"اوہ — اور کیا ڈاکٹر شیفرڈ کی آواز اب سنائی نہیں دے رہی؟"

"جی نہیں —" بیگم شاہد کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"اچھی بات ہے — لائیے ریسیور مجھے دیں۔" انھوں نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا، پھر ریسیور کان سے لگاتے ہوئے بولے:

"ہیلو — میں انسپکٹر جمشید ہوں — آپ کون ہیں؟"

"جس کی وجہ سے تم پریشان ہو۔" دوسری طرف سے ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ انھیں یوں لگا جیسے بہت سی مکھیوں کی بھنبھناہٹ نے آواز کی شکل اختیار کر لی ہو۔

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید چونکے۔

"آج شام ٹھیک سات بجے ٹی وی دیکھنا نہ بھولنا... پھر تم سب کچھ سمجھ جاؤ گے!"

"آخر تم کون ہو اور ان باتوں سے تمہارا مطلب کیا ہے؟" انسپکٹر جمشید تیز آواز میں بولے۔

"ادب سے انسپکٹر، ادب سے — میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں۔ اگر کسی دوسرے نے اس لہجے میں بات کی ہوتی تو فون پکڑنے والے کا کھیل ہی ختم ہو جاتا اور اس کا جسم برف سے بھی ٹھنڈا ہو جاتا۔

"کیا کہا۔" انسپکٹر جمشید چلائے۔۔۔ ان کی آنکھوں میں حیرت کا ایک سمندر موجیں مارنے لگا۔

"ہاں جتنا کہا ہے، اس پر عمل کرو۔ سات بجے اگر تم نے ٹیلی ویژن نہ دیکھا تو بھی اس کی کہانی بچے بچے کی زبان پر ہوگی۔"

"تم ٹیلیفون پر اثر انداز کس طرح ہوئے ہو؟"

"میں ہر چیز پر اثر انداز ہو سکتا ہوں۔۔۔ اب تم سب اس لاش پر نظریں جما دو اور دیکھو کہ کیا ہوتا ہے۔" اس کے ساتھ ہی کلک کی آواز آئی جیسے کسی نے ریسیور رکھا ہو، ساتھ ہی کوئی ہیلو ہیلو کرنے لگا:

"ہیلو۔۔۔ کون صاحب بول رہے ہیں؟" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"میں ڈاکٹر شیزرڈ ہوں۔ مجھے فون کیا گیا تھا، لیکن پھر کوئی درمیان میں بولنے لگا۔ نہ جانے کون تھا اور کیا کہہ رہا تھا۔ آپ کون ہیں؟"

"میں شاہد منیر صاحب کے گھر سے بول رہا ہوں۔ انہیں نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ ان کا جسم برف سے بھی زیادہ سرد ہو گیا ہے۔ آپ فوراً آ جائیے۔"

"اچھی بات ہے۔۔۔ میں آ رہا ہوں۔"

"شکریہ جناب۔"

انسپکٹر جمشید ریسیور رکھ کر مڑے۔ اسی وقت خان رحمان کی کپکپاتی آواز سنائی دی۔۔۔ "اوہ خدایا۔۔۔ جمشید۔۔۔ وہ۔۔۔ دیکھو

۔۔۔ دیکھو۔۔۔ وہ جل رہا ہے۔"

وہ چونک اٹھے۔ انہوں نے شاہد منیر کی طرف دیکھا۔۔۔ اس کے جسم کے اوپر اب دھواں سا پھیل گیا تھا اور وہ دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔

"ارے۔۔۔ یہ دھواں کہاں سے آ گیا۔" محمود کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔۔۔ اسی وقت فرزانہ نے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔۔۔

"خبردار۔ کوئی دھوئیں کے قریب نہ جائے۔"

وہ سب آنکھیں پھاڑے دھوئیں میں لپٹی اس لاش کو دیکھتے رہے۔۔۔ پھر نہ جانے کتنے سیکنڈ گزر گئے۔ اب دھواں اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ لاش اس میں بالکل چھپ کر رہ گئی تھی، اور پھر تو پلنگ بھی ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"یا خدا۔ کیا ہم سب کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔" بیگم شاہد منیر کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

"یہ خواب نہیں ہے۔۔۔ لیکن شاید ابھی ہم ایک اور حیرت انگیز منظر دیکھیں گے۔" انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

"خدایا۔ یہ ہم کس چکر میں پھنس گئے۔" فاروق نے زبان ہلائی۔ آج وہ بھی سب چوکڑیاں بھول گیا تھا۔

اچانک دھواں چھٹنے لگا۔۔۔ آہستہ آہستہ انہیں پلنگ نظر

آنے لگا... پھر جوں ہی دھواں کچھ اور ہلکا ہوا... ان کی سٹی گم ہو گئی۔ انہوں نے اس قسم کا منظر اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ پلنگ پر اب کوئی لاش موجود نہیں تھی۔ البتہ لاش کے جسم پر جو کپڑے تھے، وہ ضرور موجود تھے اور وہ اسی حالت میں پڑے تھے جس میں لاش موجود تھی۔

اس حیرت انگیز منظر نے انہیں دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا تھا۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے خالی پلنگ کو دیکھ رہے تھے... انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق، فرزانہ اور خان رحمان تو یہ تک بھول گئے تھے کہ وہ یہاں کیوں آئے تھے۔ انہیں اس وقت کسی چیز کا ہوش نہیں رہ گیا تھا۔ وہ سب تو اس وقت چونکے جب ایک آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی:

"کہاں ہیں شاہد منیر صاحب؟"

وہ چونک کر کمرے کے دروازے کی طرف مڑے۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر کا خوبصورت آدمی کھڑا تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں پر عینک تھی۔ اس کا رنگ بالکل سرخ تھا۔ سر پر ٹوپی تھی... نقش و نگار سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ انگریز ہے حالانکہ انگریز نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار صاف دیکھے جا سکتے تھے۔

"ڈاکٹر شیفرڈ" بیگم شاہد کے منہ سے نکلا۔

"آئیے ڈاکٹر صاحب۔" انسپکٹر جمشید اس طرح بولے جیسے ابھی ابھی گہری نیند سے جاگے ہوں۔

"ابھی ابھی... مجھے فون آپ نے ہی کیا تھا؟" ڈاکٹر شیفرڈ نے انسپکٹر جمشید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں — لیکن افسوس.... اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"کیا مطلب — کیا شاہد منیر...." ڈاکٹر اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔

"جی ہاں! ان کا جسم برف سے بھی زیادہ سرد ہو گیا تھا... پھر وہ دھوئیں میں تبدیل ہو گئے۔"

"کیا کہا — دھوئیں میں تبدیل ہو گئے۔ آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر شیفرڈ نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"ان سب کی طرف دیکھیے... میری بات کی سچائی کا ثبوت مل جائے گا۔" انسپکٹر جمشید نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

ڈاکٹر نے ان کی طرف دیکھا۔ سب نے ہاں میں سر ہلا دیے۔ بیگم شاہد منیر نے بھی یہی کیا:

"لیکن... لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"یہی تو ہم سوچ رہے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بہرحال ہم چلتے ہیں۔ بیگم صاحب آپ چاہیں تو اس واقعے کی رپورٹ درج کرا دیں۔ ویسے تو میں جانتا ہوں۔ پولیس کچھ بھی نہیں کر سکے گی۔"

"آپ کہاں جا رہے ہیں۔ آپ نے اب تک اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔" بیگم شاہد نے روتے ہوئے کہا۔

"یہ تو آپ جان ہی چکی ہیں کہ میرا نام انسپکٹر جمشید ہے۔ یہ میرے بچے محمود، فاروق اور فرزانہ ہیں اور یہ میرے دوست خان رحمان ہیں۔ دراصل شاہد منیر کے ایک دوست آئی جی صاحب کے ہاں مہمان ٹھہرے اور ان کی سفارش شاہد صاحب نے ہی کی تھی۔۔۔ لیکن مہمان ان کی کوٹھی سے غائب ہو گیا۔"

"غائب ہو گیا؟" ڈاکٹر شیفرڈ اور بیگم شاہد منیر کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"ہاں — شاید وہ بھی اسی طرح غائب ہوا ہو گا جس طرح شاہد صاحب۔۔۔ اب ہم چلتے ہیں۔۔۔ ہاں یہ بھی کہتا چلوں۔۔۔ اپنے خاوند کو مردہ خیال نہ کریں — ہو سکتا ہے وہ ابھی زندہ ہوں۔"

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ ہو سکتا ہے۔۔ جب کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے انہیں دھوئیں میں تبدیل ہوتے دیکھا ہے۔"

"اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔ اچھا خدا حافظ۔"

اور وہ باہر نکل آئے — کار میں بیٹھتے ہوئے انسپکٹر جمشید بولے:

"پروفیسر داؤد اس کیس میں ہمارے سب سے زیادہ کام آ سکتے تھے، لیکن وہ خود غائب ہو چکے ہیں۔ اس لیے اب ہم کسی اور سائنس دان کے پاس جائیں گے۔ ہو سکتا ہے، وہ ہماری کچھ مدد کر سکیں۔"

"اور ان کا نام کیا ہے؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"انہیں پروفیسر ذاکر کہتے ہیں — اور وہ پروفیسر داؤد کے دوست بھی ہیں۔"

"بہت خوب — کیا ہم اسی وقت چل رہے ہیں؟"

"ہاں! اسی وقت!"

"کس طرف چلوں؟" خان رحمان نے پوچھا۔

"دارالحکومت — ان کی کوٹھی جنوبی علاقے میں جنگل کے کنارے ہے۔"

وہ روانہ ہو گئے۔ سب اپنی اپنی سوچ میں گم تھے۔ حالات عجیب و غریب تھے۔۔۔ یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ ان کا سابقہ ایک بہت بڑے سائنس دان سے آ پڑا ہے لیکن وہ کون ہے کیا چاہتا ہے اور کہاں ہے۔۔۔ وہ کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔

"آخر اس نے ہمیں ٹی وی دیکھنے کے لیے کیوں کہا ہے؟" بہت دیر بعد فرزانہ نے کار میں چھائی ہوئی خاموشی کا سینہ چاک کیا۔

"وہ اپنا تعارف کرائے گا۔" فاروق بول اٹھا۔۔ محمود اور فرزانہ ہنس پڑے۔

"تم ہنسے کیوں — میرا خیال ہے فاروق ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

"لیکن۔۔۔ وہ ٹی وی پر اپنا تعارف کس طرح کرا سکتا ہے؟"

"یہی تو دیکھنا ہے — خیر۔۔۔ فی الحال تو ہم پروفیسر ذاکر کے ہاں چل رہے ہیں — دیکھیں وہ کیا بتاتا ہے؟"

ایک گھنٹے بعد وہ پروفیسر ذاکر کی کوٹھی کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ ملازم نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ یہ وہ باہر ہی دیکھ چکے تھے کہ کوٹھی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا یعنی ایک رہائش کے لیے اور دوسرا تجربات کے لیے بنایا گیا تھا۔۔۔ پروفیسر شاید اس وقت رہائشی حصے میں ہی موجود تھا کیوں کہ جلد ہی انہوں نے قدموں کی آواز سنی۔

اندر داخل ہونے والا آدمی ادھیڑ عمر کا تھا۔ اس کے بال بالکل سفید تھے۔ بھنویں تک سفید تھیں۔ اس نے انہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ پھر مسکرا کر بولا:

"اگر میں یہ کہوں۔۔۔ کہ انسپکٹر جمشید اس وقت پروفیسر داؤد کی گمشدگی کے سلسلے میں میرے پاس آئے ہیں، تو یہ غلط نہیں ہوگا؟"

"آپ کا خیال ٹھیک ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

پروفیسر ذاکر نے ان سب سے ہاتھ ملائے اور پھر وہ بیٹھ گئے۔ انسپکٹر جمشید نے مختصر طور پر حالات انہیں بتائے، شاہد منیر کے دھوئیں میں تبدیل ہونے کا واقعہ بھی سنایا۔ پروفیسر ذاکر پرسکون انداز میں یہ سب کچھ سنتے رہے۔ آخر کہنے لگے:

"سائنس ابھی نہ جانے کیا کیا گل کھلائے۔ بہرحال میں اعتراف کرتا ہوں کہ جو شخص بھی یہ سب کچھ کر رہا ہے وہ بہت بڑا سائنس دان ہے۔۔۔ اس کے ارادے کیا ہیں، مجھے کچھ اندازہ نہیں۔۔۔ شاید

اس وقت ہمارے ملک میں تو کیا، آس پاس کے ملکوں میں بھی اس کے مقابلے کا سائنس دان نہ ہوگا۔"

"جو لوگ غائب ہوئے ہیں، وہ زندہ تو ہوں گے۔" انسپکٹر جمشید نے سوال کیا۔

"یہ ضروری نہیں، ہو سکتا ہے، وہ مر چکے ہوں۔۔۔ ایک ایسی موت جس کے بارے میں ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔"

"نہیں نہیں۔۔۔ میرا دل کہتا ہے۔۔۔ وہ لوگ زندہ ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"شاید ایسا ہی ہو۔ لیکن یہ تو سوچیے کہ جو سائنس دان انسانوں کو اس طرح غائب کر سکتا ہے، وہ انہیں ہلاک بھی تو کر سکتا ہے۔"

"ہاں۔ لیکن میرا خیال یہی ہے کہ اس نے ان تینوں کو ہلاک نہیں کیا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ آدمی کو غائب کس طرح کر دیتا ہے؟"

"افسوس۔ میرا علم اس کے مقابلے میں بہت کم ہے۔" پروفیسر ذاکر نے نفی میں سر ہلایا۔

"کوئی ایسی ترکیب۔۔۔ جس سے ہم غائب ہونے سے محفوظ رہ سکیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"میں اس پہلو پر غور کر رہا ہوں۔ اگر کچھ سوجھ گیا تو فون کر دوں گا۔"

"بہت بہت شکریہ۔" انسپکٹر جمشید اٹھتے ہوئے بولے۔

پروفیسر ذاکر نے سب سے مصافحہ کیا۔۔۔ اچانک انسپکٹر جمشید

ٹھٹھک کر رک گئے...

ڈرائنگ روم کی دائیں طرف کی دیوار پر ایک فریم کی ہوئی تصویر لگی ہوئی تھی، اور اس تصویر پر ان کی نظر پہلی مرتبہ پڑی تھی... ان کی نظریں تصویر سے چپک سی گئیں... ان کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ تصویر ایک نوجوان اور خوبصورت آدمی کی تھی۔ اس کی آنکھوں پر عینک تھی۔ آنکھوں کا رنگ گہرا نیلا تھا۔

"یہ... یہ تصویر کس کی ہے؟"

"یہ میرے دوست کی تصویر ہے... میرے بچپن کے دوست کی — ہم نے سائنس کی تعلیم ایک ساتھ حاصل کی تھی۔ جب ہم وطن لوٹے تو یہ اچانک نہ جانے کہاں غائب ہوگیا۔ میں نے اسے بہت تلاش کیا، مگر اس کا پتا نہ چلا۔"

"غائب ہوگیا۔" انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

"ہاں — نہ جانے اسے زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا تھا — آج تک اس کا کوئی پتا نہ چل سکا۔" پروفیسر نے بتایا۔

"اور اس کے گھر والے؟"

"اس کا تھا ہی کون — جب میرے ساتھ سائنس کی تعلیم کے لیے یورپ گیا تھا تو اس کی صرف ایک بڑی بہن تھی... جس کی شادی ہوگئی تھی۔ نہ جانے وہ بھی اب کہاں ہوگی۔ اس نے کبھی مجھ سے رابطہ قائم نہیں کیا۔ اپنے بھائی کے بارے میں

نہیں پوچھا۔"

"اوہ — حیرت ہے۔" انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

"لیکن آپ اتنے حیران کیوں ہیں اسے دیکھ کر — کیا آپ اسے جانتے ہیں؟"

"نہیں میں اسے نہیں جانتا۔"

"تو پھر آخر بات کیا ہے؟"

"کیا آپ کا یہ دوست دولت مند تھا؟"

"ہاں، باپ دادا کے زمانے کی بے شمار دولت اس کے پاس تھی... مختلف بنکوں میں اور خفیہ جگہوں پر۔"

"ہوں — آپ کہتے ہیں کہ ایک مدت سے آپ کا دوست غائب ہے... لیکن میں نے اسے ایک آدھ دن پہلے ہی کہیں دیکھا ہے۔"

"کیا کہا۔" پروفیسر ذاکر حلق پھاڑ کر چلائے۔

"ہاں — لیکن مجھے یاد نہیں آرہا کہ کہاں دیکھا ہے۔ تاہم میں یاد کرنے کی کوشش ضرور کروں گا اور اگر یاد آگیا تو آپ کو ضرور بتاؤں گا۔"

وہ پروفیسر کو ہکا بکا چھوڑ کر باہر نکل آئے۔

پہاڑ اُڑا دو

"اس کیس میں ابھی تک ہمیں کچھ بھی کرنے کا موقع نہیں ملا۔" فرزانہ نے باہر نکلنے کے بعد مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"تمہیں ہی کیا... کسی کو بھی موقع نہیں ملا۔ صرف مجرم ہی کر رہا ہے جو کچھ کر رہا ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"یہ تصویر کا کیا معاملہ تھا؟" محمود نے پوچھا۔

"ابھی مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ویسے مجھے یقین ہے، تصویر والے آدمی کو میں کہیں دیکھ چکا ہوں۔ اور اسے دیکھے زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی۔"

"یار جمشید میں سوچ رہا ہوں... آخر اس نے ہمیں ٹی وی دیکھنے کی کیوں دعوت دی ہے۔" خان رحمان بولے۔

"جہاں تک میں سمجھتا ہوں، وہ ٹی وی کے ذریعے پورے ملک کے لوگوں کو کوئی پیغام دینا چاہتا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لیکن ابا جان۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آخر وہ ٹی وی کے ذریعے پیغام کس طرح دے گا۔" فاروق نے اُلجھ کر کہا۔

"یہ آج شام کو معلوم ہو جائے گا۔" فرزانہ بولی۔

"کاش مجھے یہ یاد آجائے... میں نے تصویر والے آدمی کو کہاں دیکھا ہے۔ مجھے نہ جانے کیوں یہ محسوس ہو رہا ہے کہ یہ بات معلوم ہو جانے کے بعد میں اس کیس کو حل کر لوں گا۔"

"اس کی تو ایک آسان ترکیب موجود ہے۔" فرزانہ بولی۔

"آسان ترکیبیں بتانے کی تو فرزانہ مشین ہے۔" فاروق کے منہ سے نکلا۔

"کیسی ترکیب؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"دو تین دن کے اندر آپ جس جس آدمی سے بھی ملے ہیں، ان سے دوبارہ ملیے اور اس تصویر کو ذہن میں رکھیے، اس طرح وہ آدمی خود بخود آپ کے سامنے آجائے گا۔"

"واہ کتنی زبردست ترکیب ہے۔" فاروق نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔ "لیکن یہ ترکیب اس وقت فیل ہو جائے گی اگر ابا جان نے تصویر والے آدمی کو راہ چلتے... یا اِدھر اُدھر کہیں دیکھا ہو۔"

"تجربہ کر دیکھنے میں کیا حرج ہے۔" فرزانہ بولی۔

"بات دراصل یہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔ فریم والی تصویر میں اور اس آدمی میں کچھ فرق ضرور ہے جس کی وجہ سے میں یہ نہیں سمجھ پا رہا ہوں کہ کون سے آدمی کی شکل صورت تصویر سے ملتی جلتی ہے۔ مطلب یہ کہ پروفیسر ذاکر کے کمرے میں جو تصویر لگی ہے وہ اس

وقت کی ہے جب ان کا دوست غائب بھی نہیں ہوا تھا۔ اور اس
واقعے کو نہ جانے کتنے سال گزر چکے ہیں۔۔۔ ارے میں نے تو پروفیسر
سے اس کے دوست کا نام تک معلوم نہیں کیا۔" انسپکٹر جمشید چونکے۔
"فون کرکے معلوم کر لیں۔" خان رحمان بولے۔
"ہاں۔ بلکہ میں یہ بھی پوچھوں گا کہ انہیں غائب ہوئے کتنے
سال گزر چکے ہیں تاکہ یہ اندازہ لگا سکوں کہ اس عرصے میں ایک آدمی
کے حلیے میں کس حد تک فرق پڑ سکتا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ پھر
ایک جگہ رک کر انہوں نے پروفیسر داؤد کو فون کیا:
"ہیلو پروفیسر۔۔۔ معاف کیجیے۔۔۔ میں آپ کے دوست کا نام
پوچھنا تو بھول ہی گیا۔"
"اس کا نام ڈاکٹر شبیر فراز ہے۔" پروفیسر نے بتایا۔
"اور انہیں غائب ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔"
"تقریباً دس سال۔"
"اس کا مطلب ہے، اب تو وہ ادھیڑ عمر کے ہوں گے۔"
"ہاں۔ اگر وہ زندہ ہوا تو۔" پروفیسر نے سرد آہ بھر کر کہا۔
"فکر نہ کریں۔ میں بہت جلد آپ کو ان کے بارے میں بتاؤں گا۔"
یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا اور واپس ان تک آ گئے۔ اب ان
کا رخ پھر آئی جی صاحب کے گھر کی طرف تھا۔ انہیں پورے
حالات سے باخبر بھی تو کرنا تھا۔۔۔ شام کو ٹی وی دیکھنے کے

بارے میں بھی تو بتانا تھا۔
وہ کس قدر عجیب و غریب مجرم کے چکر میں الجھے ہوئے تھے
۔۔۔ جو آج تمام ان سے ٹی وی پر بات کرنے کا اعلان کر چکا تھا اور
جب انسپکٹر جمشید نے آئی جی صاحب کو یہ بات بتائی تو انہوں نے
انہیں اس طرح دیکھا جیسے وہ پاگل ہو گئے ہوں۔ پھر جب انہوں نے
ان کے دوست شاہ منیر کے دھوبی میں تبدیل ہونے کا واقعہ بتایا
تو وہ پتھر کے بت بن کر بیٹھ گئے۔ پندرہ منٹ بعد وہ اٹھے اور
گھبراہٹ کے عالم میں ادھر ادھر فون کرنے لگے۔ ان کا چہرہ پسینے
میں ڈوب گیا تھا اور وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھے دکھائی دے
رہے تھے۔

تمام بڑے بڑے افسر ایک ہال کمرے میں ٹی وی کے سامنے
بیٹھے تھے۔۔۔ ٹی وی پر معمول کے مطابق پروگرام پیش کیے جا
رہے تھے۔۔۔ اور پھر بالکل ٹھیک سات بجے ٹیلی ویژن کی سکرین
پر ایک جھماکا سا ہوا۔۔۔ چلتا ہوا پروگرام یک دم غائب ہو گیا اور
سکرین پر ایک تصویر نمودار ہوئی۔ یہ تصویر ایک ادھیڑ عمر کے آدمی
کی تھی۔ اس کی آنکھوں پر عینک تھی، آنکھیں نیلی تھیں۔۔۔ اور
چہرے پر ایک چھوٹی سی داڑھی تھی۔۔۔ سر کے تمام بال غائب

تھے... کھوپڑی انڈے کے چھلکے کی طرح تھی۔ مونچھیں گھنی تھیں، جنہوں نے اوپر کے ہونٹ کو چھپا لیا تھا۔ وہ سب دم بخود ہو کر اسے دیکھ رہے تھے کہ انہوں نے اس کے لب ہلتے دیکھے:

"آج میں اپنی قوم سے مخاطب ہوں۔ آپ سب کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اب اس ملک کا حکمران میں ہوں، اس ملک پر میری حکومت ہے... کوئی میرے حکم کے خلاف نہیں چل سکتا... جو لوگ میرا حکم مانیں گے فائدے میں رہیں گے۔ تمام محکموں کو میں خود کنٹرول کروں گا۔ میری ہدایات مل جایا کریں گی۔ اور یہ ہدایات جب بھی ضرورت سمجھوں گا، دے دیا کروں گا۔ تمام لوگ پرسکون رہ کر اپنا کام کریں۔ آج سے اس ملک کے صدر اور وزیر اعظم کی کوئی حیثیت نہیں رہی۔ اب اس ملک میں ان کا حکم نہیں چلے گا۔ میں انہیں صدارت اور وزارت کے عہدوں سے اتارتا ہوں۔ انہیں چاہیے، وہ چپکے اپنے گھروں میں خاموشی سے بیٹھ جائیں۔ باقی لوگ اپنی اپنی جگہوں پر کام کرتے رہیں... ان کی تنخواہ بڑھا دی جائے گی... ملک کی پیداوار میں بے تحاشا اضافہ کر دیا جائے گا اور صرف چند مہینوں میں ملک اس حد تک خوشحال ہو جائے گا کہ پچھلے پچاس ساٹھ سال میں نہ ہوا ہوگا۔

میری قوم کے لوگو۔ تم یہ اعلان حیران ہو کر سن رہے ہو گے۔ ابھی پولیس والے میری تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔ اب میں

کچھ اپنے بارے میں بھی بتا دوں۔ میں ایک بہت بڑی طاقت ہوں۔ میں نے اس ملک پر حکومت کرنے کا خواب بہت مدت پہلے دیکھا تھا... اور اس وقت سے میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کس طرح اس ملک پر حکومت کر سکتا ہوں۔ آخر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ مجھے تلاش کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ میں مرمر آباد میں موجود ہوں۔ مرمر آباد کی سب سے اونچی چوٹی پر میری رہائش ہے۔ لیکن تم میں سے کوئی بھی مجھ تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اب بس۔ کل میں پھر اس وقت قوم سے خطاب کروں گا۔"

تصویر سکرین سے غائب ہو گئی اور ٹی وی سٹیشن کا پروگرام شروع ہو گیا۔ تمام آفیسر سکتے کے عالم میں بیٹھے رہ گئے۔

"اوہ... ہم سب کو تو اس طرح سانپ سونگھ گیا جیسے ہم نے موت کو سامنے دیکھ لیا ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے... یہ جو کوئی بھی ہے... اسے ختم کرنا کیا مشکل ہے۔ چند گھنٹوں میں اس پورے پہاڑ کو ہی اڑایا جا سکتا ہے۔" ڈی آئی جی صاحب بولے۔

عین اسی وقت فون کی گھنٹی چیخ اٹھی۔ آپریٹر نے بتایا کہ آئی جی صاحب کا فون ہے... وزیر اعظم صاحب ان سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ آئی جی صاحب گھبرا کر اٹھے اور فون تک پہنچے۔

"یہ سب کیا بکواس ہے۔ اس شخص کو اس کی پہاڑی سمیت نیست و نابود کر دیا جائے گا۔" اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

خوفناک جنگ

ہال میں موجود سب لوگ اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ انہیں اپنے ذریاعظم کا حکم مل گیا تھا... وہ سب اس وقت مرمر آباد پہنچ جانا چاہتے تھے۔ اپنے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی پوری طاقت کے ساتھ اس عجیب شخصیت کو ختم کر دینا چاہتے تھے... ہال میں کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی... وہ سب چیخ رہے تھے، چلا رہے تھے... اس وقت ایک آدمی ایسا بھی تھا جو ان سب کو رکنے، بیٹھنے اور غور کرنے کی دعوت دے رہا تھا اور وہ انسپکٹر جمشید تھے، لیکن ان کی کسی نے نہ سنی۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہال میں ان کے اور خان رحمان، محمود، فاروق فرزانہ کے علاوہ کوئی بھی نہ رہ گیا۔

"آپ ان سے کیا کہنا چاہتے تھے؟" محمود نے بے تاب ہو کر کہا۔

"میں انہیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ مرمر آباد پر اندھا دھند حملہ کرنا بے سود ہو گا۔ جو سائنس دان اس طرح ٹی وی کی سکرین پر آ سکتا ہے، آدمیوں کو دھوئیں میں تبدیل کر کے غائب کر سکتا ہے، اس نے لازمی وجہ کے تو اپنا پتا نہیں بتا دیا ہو گا۔ یہ بات وہ بھی جانتا

ہو گا کہ اسے ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ تو... تو کیا اس نے اپنی حفاظت کا کوئی بندوبست نہ کیا ہو گا؟" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" فاروق بولا۔

"تو پھر اب کیا ہو گا؟" خان رحمان بے کلی کے عالم میں بولے۔

"یہ لوگ ناکام ہو جائیں گے اور اس وقت انہیں یہ احساس ہو گا کہ ہم کس قدر طاقت ور آدمی سے دوچار ہیں۔"

"کیا تم مرمر آباد نہیں جاؤ گے؟" خان رحمان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"وہاں جا کر کیا کریں گے۔ وہاں جانا ٹھیک نہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیوں؟" فرزانہ نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"کیا تم لوگ وہاں جانا چاہتے ہو؟"

"ہاں ابا جان — ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔"

"تو سنو — ہم وہاں کل چلیں گے۔" انسپکٹر جمشید نے پر اسرار لہجے میں کہا۔

"جی کیا مطلب؟" تینوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"کل وہاں مرمر آباد کی پہاڑیوں کے آس پاس کوئی نہیں ہو گا۔ اس وقت ہم اطمینان سے جائزہ لے سکیں گے۔"

"لیکن ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آج وہاں کیا ہوتا ہے؟"

"اس کی تفصیل کل کے اخبار میں پڑھ لینا۔"

"بہت اچھا۔ جیسے آپ کی مرضی۔ ویسے میرا خیال ہے مرمر آباد میں فوج بھی پہنچ چکی ہوگی۔" فاروق بولا۔

"ہاں ہماری حکومت نے بھی سوچا ہوگا کہ مرمر آباد میں کوئی فوج ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوگی، حالانکہ ایسا نہیں ہے.. اس وقت ان لوگوں کی حیرت کا عالم واقعی عجیب ہوگا جب وہاں ان کے مقابلے پر کوئی بھی نہ آئے گا۔ اس کے باوجود..!"

ان کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی تھی۔ وہ اٹھ کر فون کی طرف چل پڑے۔ اور خان رحمان نے تینوں سے کہا:

"بھئی... سچ تو یہ ہے کہ میرا دل مرمر آباد جانے کو بہت چاہ رہا ہے۔ اگر تمہارے ابا جان نہیں جاتے تو نہ جائیں۔ میں ضرور جاؤں گا۔ کیا تم تینوں میرے ساتھ چلنا پسند کرو گے؟"

"ہم ابا جان کی اجازت کے بغیر کیسے جا سکتے ہیں؟"

"اجازت کی پروا نہ کرو۔ وہ میں لے دوں گا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔"

وہ انسپکٹر جمشید کی طرف متوجہ ہو گئے... وہ فون میں کسی کی بات سن رہے تھے۔ پھر انہوں نے کہا:

"لیکن میں اسے مناسب نہیں سمجھتا۔"

پھر وہ دوسری طرف سے کی جانے والی بات سنتے رہے۔ آخر ریسیور رکھ کر واپس آ گئے۔ ان کی پیشانی پر سلوٹیں تھیں۔ جیسے فون سن کر پریشان ہو گئے ہوں۔

"کیا بات ہے جمشید؟"

"آئی جی صاحب کا فون تھا۔ انہیں کہیں راستے میں خیال آیا کہ میں تو ان کے ساتھ ہوں ہی نہیں۔ وہ وجہ پوچھ رہے تھے، میں نے کہہ دیا کہ میں اسے مناسب نہیں سمجھتا۔ لیکن وہ نہیں مانے۔ انہوں نے حکم دیا کہ میں فوراً مرمر آباد پہنچ جاؤں۔"

"اوہ — یہ تو بہت اچھا ہوا۔ ہم تو پہلے ہی وہاں جانے کی ٹھان چکے ہیں۔"

"لیکن — وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے۔" انسپکٹر جمشید نے فکرمند ہو کر کہا۔

"آخر کیوں — وہاں کیا ہوگا؟"

"آؤ... اب جانا تو پڑ ہی گیا ہے... خود ہی دیکھنا اپنی آنکھوں سے۔" انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ان کی کار بھی مرمر آباد کی طرف جا رہی تھی۔

مرمر آباد کی پہاڑیوں پر آج عجیب منظر تھا، یہاں اتنے آدمی

بھی دیکھنے میں نہ آئے ہوں گے... سیکڑوں فوجی پہاڑی مورچے
سنبھال چکے تھے... پولیس والے اپنے انتظامات میں لگے ہوئے تھے
ہر محلے کے بڑے بڑے افسر یہاں الگ موجود تھے تاکہ جو بھی
صورت حال پیش آئے اس سے نبٹا جا سکے۔

مرمر آباد کی سب سے اونچی چوٹی پر ایک عجیب و غریب سی
عمارت نظر آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے پہاڑوں کو تراش کر ہی
اسے تیار کیا گیا ہو۔ اس عمارت میں جا بجا روشن دان تھے... ان
میں سے ہر روشن دان میں ایک آدمی کا چہرہ نظر آ رہا تھا اور
بندوق کی قسم کے ہتھیار کی نالی جھانک رہی تھی... عمارت کے
اوپر شیشے کا ایک گنبد بنا ہوا تھا جس کا رنگ دھوئیں کا سا تھا۔ اس
گنبد کے عین درمیان میں سے ایک لوہے یا کسی اور دھات کا
پائپ سا اوپر اٹھتا چلا گیا تھا۔ اس پائپ کے سرے پر ایک جھنڈا
لہرا رہا تھا۔ جھنڈے پر اس شخص کی تصویر تھی جو ٹی وی پر لوگوں
سے مخاطب ہو چکا تھا۔

اچانک فوج کے ایک آفیسر کی لاؤڈ سپیکر پر آواز ابھری...
... اور پہاڑیوں سے ٹکرانے لگی:

"مسٹر سائنس دان... تم جو کوئی بھی ہو خود کو قانون کے حوالے
کر دو۔ تم ضرور کوئی پاگل ہو... ہم تمہارا علاج پاگل خانے میں
کرائیں گے۔ اگر پانچ منٹ کے اندر اندر تم عمارت سے باہر نہ

آئے تو پہاڑ کی اس چوٹی کو جس پر عمارت بنی ہوئی ہے، اڑا دیا جائے گا۔
اس غرض کے لیے ہم ہلکی توپیں اپنے ساتھ لائے ہیں۔"

یہاں تک کہہ کر آفیسر خاموش ہو گیا... دوسری طرف مکمل
خاموشی طاری رہی اور کوئی جواب نہ دیا گیا... آفیسر نے اپنے سے
بڑے آفیسر کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔ آخر اس نے گولہ باری
کرنے کا حکم دے دیا۔ توپوں کے منہ سے گولے دھائیں دھائیں
کی آواز سے نکلے اور تیر کی طرح عمارت کی طرف گئے... لیکن دوسرا
لمحہ چونکا دینے والا تھا۔ گولے عمارت تک پہنچے بھی نہ تھے کہ ریت
کے ذروں میں تبدیل ہو کر نیچے گر گئے۔

پہلی بار فوجی آفیسروں کی پیشانیوں پر فکر کی لکیریں نمودار ہوئیں
اب عام فائرنگ کا حکم دیا گیا مگر اس سے بھی کچھ نہ بنا۔ گولیاں راستے
میں ہی گر رہی تھیں۔ اب تو سب کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

"پہاڑی کے اوپر عمارت تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔"
پولیس کے اعلیٰ افسر نے یہ دیکھ کر نیا حکم جاری کیا۔

چشم زدن میں سیکڑوں پولیس والے پہاڑیوں پر چڑھنے لگے...
ان میں سے ہر ایک مسلح تھا۔ انہیں کسی نے نہ روکا... اوپر سے
کوئی فائر بھی نہ کیا گیا... ان کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی کہ آخر
روشن دانوں میں موجود دشمن کے آدمی ان پر فائرنگ کیوں نہیں کر
رہے جب کہ وہ برابر عمارت کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔ سب کی

نظریں اوپر چڑھنے والوں پر بھی تھیں ۔ ۔ ۔ اگرچہ یہ حکم صرف پولیس کے نوجوانوں کو دیا گیا تھا لیکن جوش میں ان کے ساتھ فوجی بھی شامل ہو گئے تھے ۔ اور پھر سب سے اوپر جانے والا آدمی رک گیا ۔ اس کے چہرے پر بلا کی حیرت جھلکنے لگی ۔ اس کے سامنے کوئی چیز آ گئی تھی دیوار کی قسم کی چیز ۔ ۔ ۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ وہ دیوار انہیں نظر نہیں آ رہی تھی ۔ ۔ ۔ اس نے غور سے دیکھا ۔ ۔ ۔ ۔ وہ دیوار ایک ایسے شیشے کی بنی ہوئی تھی جو بہت مشکل سے نظر آ سکتا تھا اور ساتھ ہی اسے یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ پوری چوٹی اسی دیوار کے گھیرے میں تھی ۔

تھوڑی دیر بعد دوسرے لوگ بھی مختلف جگہوں پر اس دیوار تک پہنچ چکے تھے اور ہر کوئی رک گیا تھا ۔ انہوں نے دیوار پر اپنا پورا زور صرف کر دیا ۔ ۔ ۔ بندوقوں کے بٹ بھی مارے لیکن اس کا کچھ نہ بگڑا ۔ نیچے کھڑے ہوئے انجینیر اور دوسرے لوگ حیران تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ہوا میں بندوقوں کے بٹ کیوں چلا رہے ہیں ۔ آخر لاؤڈ سپیکر پر ان سے کہا گیا :

"یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو ۔ ۔ ۔ کیا ہوا سے لڑ رہے ہو ؟"

"ہمارے راستے میں ایک دیوار ہے ۔ ۔ ۔ ۔ نہ جانے کس چیز کی بنی ہوئی ہے جس نے ہمارا راستہ روک رکھا ہے ۔" ایک سپاہی نے چلا کر کہا ۔ اس کی آواز پہاڑوں سے ٹکراتی ہوئی پوری وادی میں پھیل گئی اور نیچے موجود لوگوں تک بھی پہنچ گئی ۔

"دیوار ۔ مگر ہمیں تو کوئی دیوار نظر نہیں آ رہی ۔" لاؤڈ سپیکر پر کہا گیا ۔

"آپ کو کیسے نظر آ سکتی ہے ۔ یہ تو ہمیں ایک انچ کے فاصلے سے بھی بہت مشکل سے نظر آ رہی ہے ۔" اس سپاہی نے کہا ۔

"بہت اچھا ۔ ہم اس دیوار کو توڑنے کا سامان اوپر بھیج رہے ہیں ۔" اعلان ہوا ۔

اور فوراً ایک دوسری پارٹی اوپر کی طرف روانہ ہوئی ۔ اوپر ابھی تک مکمل خاموشی طاری تھی ۔ جیسے عمارت میں کوئی زندہ شخص موجود ہی نہ ہو ۔

نئی پارٹی جو اوپر روانہ ہوئی اس کے پاس بہت سے دستی بم اور نہ جانے کیا کیا کچھ تھا ۔ آخر وہ دیوار تک پہنچ گئے ۔ سب سے پہلے بم دیوار پر رکھ کر چلایا گیا ۔ ۔ ۔ لیکن وہ صرف گھوم کر ہی رہ گیا ۔ اس سے مایوس ہو کر ایک دستی بم دیوار پر اس جگہ مارا گیا جہاں کوئی آدمی نہ تھا ۔ بم پھٹا اور اس کے ذرے فضا میں دور دور تک بکھر گئے ۔ لیکن دیوار کا بال بھی بیکا نہ ہوا ۔ وہ سکتے میں آ گئے ۔ جسے وہ معمولی کام سمجھ کر شہر سے روانہ ہوئے تھے ، وہ ایک مشکل ترین کام ثابت ہو رہا تھا ، یہ چھوٹی سی عمارت ان کے لیے ناقابل تسخیر قلعہ ثابت ہو رہی تھی ۔

اچانک عمارت سے ایک آواز نکل کر وادی میں گونجنے لگی ۔ یہ وہی آواز تھی جو لوگ ٹی وی پر سن چکے تھے ۔

"سنو لوگو! میں اس وقت تک خاموش اس لیے بیٹھا رہا کہ
تم لوگ اپنی سی کوشش کر کے دیکھ لو۔ تم دیکھ ہی چکے ہو کہ میرا
کچھ نہیں بگاڑا جا سکتا... اگر میں چاہتا تو تم عمارت کی طرف فائر
بھی نہ کر سکتے اور نہ توپیں چلا سکتے۔ نہ اس دیوار تک پہنچ سکتے
اب ایک نمونہ میں تم لوگوں کو بھی دکھانا چاہتا ہوں۔ تو... میرا
مرنے کے لیے بھی تیار ہو جاؤ۔ کیونکہ تم اس طرح مجھے اپنا حاکم نہیں
مانو گے۔"

وہ سب چونک اٹھے۔ پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف
دیکھنے لگے کہ نہ جانے اب کیا ہوتا ہے... وہ کیا کرتا ہے۔

اچانک روشن دانوں میں موجود چہرے حرکت میں آئے... انہوں
نے اپنی بندوقوں کی نالیں سیدھی کر لیں... نالوں کا رخ ان
سپاہیوں کی طرف تھا جو ابھی تک دیوار پر بندوقوں کے بٹ مار
رہے تھے یا برما چلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ان کے رنگ اڑ گئے... جسموں میں تھرتھری دوڑ گئی...
کیونکہ وہ سب ان کے نشانے پر تھے۔

دو اور غائب

جونہی ان کی کار مرمرآباد کی پہاڑیوں کے نزدیک پہنچی،
انہوں نے بیسیوں دل دوز چیخیں سنیں اور وہ تھرا کر رہ گئے...
دور دور تک انہیں انسانی وجود نظر آ رہے تھے... وہ سراسیمگی
کے عالم میں ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے۔

"آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"کیا مطلب۔ کیا خیال تھا تمہارا۔" خان رحمان نے چونک کر کہا۔

"میں جانتا تھا، یہ لوگ اندھا دھند پہاڑ کی چوٹی پر حملہ کریں گے
اور نقصان اٹھائیں گے... حملہ کرنے سے پہلے ہمیشہ دشمن کے
بارے میں پوری طرح جان لینا چاہیے کہ وہ کون ہے، کیا ہے،
کتنی طاقت کا مالک ہے۔ ایک سائنس دان جو آدمیوں کو دھوئیں
میں تبدیل کر دیتا ہے اور ٹی وی کی سکرین پر نمودار ہو سکتا ہے...
وہ کس قدر خطرناک ہو سکتا ہے، انہیں پہلے ہی سوچ لینا چاہیے
تھا۔ میں نے ہال میں بھی سب کو روکنے کی کوشش کی تھی مگر میری
کسی نے نہ سنی... اور نتیجہ یہ نکلا کہ بیسیوں آدمی اپنی جانوں سے
ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔"

"لیکن... لیکن یہ کیسے ہوا ہوگا؟"

"یہ تو آگے چل کر ہی معلوم ہوگا۔"

پھر وہ ہجوم کے پاس پہنچ گئے۔ خان رحمان نے کار ایک طرف کرلی۔

"کار میں ہی بیٹھے رہو۔ ابھی اترنے کی ضرورت نہیں ہے" انسپکٹر جمشید بولے۔

انھوں نے بھاگتے ہوئے کئی آدمیوں کو روکنے کی کوشش کی... لیکن کسی نے ان کی بات سننے کی کوشش نہ کی۔ وہ سب بوکھلائے ہوئے تھے... آخر انسپکٹر جمشید کار سے باہر نکلے اور اس کی چھت پر چڑھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ ایک طرف انہیں فوج اور پولیس کے آدمی جمع ہوتے نظر آئے۔ بہت سے آدمی لاشوں کو اٹھا اٹھا کر ایک جگہ ڈھیر کر رہے تھے۔

"آؤ میرے ساتھ۔" انھوں نے چھت پر سے نیچے چھلانگ لگاتے ہوئے کہا۔

وہ کار سے باہر نکل آئے... کار انھوں نے وہیں چھوڑ دی اور پیدل آگے بڑھنے لگے یہاں تک کہ وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں لاشیں جمع کی جا رہی تھیں۔ یہاں انہیں آئی جی اور ڈی آئی جی صاحب نظر آئے۔ انھوں نے بھی انہیں دیکھ لیا۔

"جمشید... خدا کی پناہ — تم اب آ رہے ہو؟" آئی جی بولے۔

"میں آپ کا فون موصول ہونے کے بعد روانہ ہوا تھا۔"

"لیکن تم ہمارے ساتھ کیوں نہیں چلے آئے تھے؟"

"میں نے سب لوگوں کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ میں اس جگہ دوبارہ خود حملہ کرنے سے انہیں روکنا چاہتا تھا... میں چاہتا تھا، باقاعدہ پروگرام بنایا جائے، خوب غور و خوض کیا جائے.... یہاں آکر خاموشی سے حالات کا جائزہ لیا جائے، لیکن میری کسی نے نہ سنی۔"

"تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ افسوس ہم اپنے بہت سے نوجوانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔"

"یہ کیسے ہوا؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

جواب میں ڈی آئی جی صاحب نے انہیں پوری تفصیل سنا دی۔ آخر میں انھوں نے بتایا کہ روشنی والوں سے جو آدمی جھانک رہے ہیں، انھوں نے جب بندوقیں چلائیں تو ان میں سے گولیوں کی بجائے لہریں سی نکلیں... آسمانی بجلی کی سی لہریں... آن واحد میں یہ لوگ نیچے آ رہے... اف خدا — یہ اس طرح جل گئے ہیں جیسے آسمانی بجلی سے درخت جل جاتے ہیں۔"

انھوں نے لاشوں کی طرف دیکھا اور سکتے میں رہ گئے۔ لاشیں کوئلہ بن چکی تھیں۔

"اب کیا کرنے کا ارادہ ہے؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"فوج کے کمانڈران چیف معائنے کے لیے آ رہے ہیں۔ وہ حالات کا جائزہ لینے کے بعد کوئی قدم اٹھانے کا حکم دیں گے"

"میں جانتا ہوں، وہ کیا حکم دیں گے" انسپکٹر جمشید نے پریشان ہو کر کہا۔

"تم... تم کیسے جانتے ہو؟" آئی جی صاحب کے لہجے میں حیرت تھی۔

"میں اندازہ لگا سکتا ہوں۔ وہ جائزہ لینے کے فوراً بعد طیاروں کے ذریعے اس پہاڑی کے اوپر بمباری کا حکم دیں گے، لیکن میں یہ بات واضح کر دوں کہ اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا — ہاں — یہ ہو سکتا ہے کہ ان طیاروں کو نقصان پہنچے۔"

"اب یہ تو ان کے آنے کے بعد ہی پتہ چلے گا۔" آئی جی بولے اور انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔ لاشیں ابھی تک لائی جا رہی تھیں، دو گھنٹے بعد معلوم ہوا کہ پینتالیس آدمی جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ عین اسی وقت کمانڈر انچیف کے آنے کی خبر ملی۔

تھوڑی دیر بعد آئی جی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب حیرت میں ڈوبے ہوئے انسپکٹر جمشید کی طرف دیکھ رہے تھے، کیوں کہ کمانڈر صاحب نے فوراً ہی طیاروں کے ذریعے بمباری کا حکم دے دیا تھا۔

اور اب فضا میں دور سے طیارے آتے دکھائی دے رہے تھے

... باقی لوگوں کو دور ہٹ جانے کی ہدایات دے دی گئی تھیں اور سب لوگ ادھر ادھر پناہ لے رہے تھے۔ انسپکٹر جمشید بھی انہیں لے کر کار میں آ بیٹھے اور کار بیک ہونے لگی۔

دیکھتے ہی دیکھتے تین طیارے زبردست گھن گرج کے ساتھ ان کے سروں پر سے گزر گئے۔ پھر انہوں نے ایک ساتھ غوطہ لگایا اور تین بم گراتے ہوئے آگے نکل گئے۔ بم تیر کی طرح غار کی طرف آئے لیکن پھر انہوں نے ایک حیرت انگیز ترین منظر دیکھا، تینوں بم جھنڈے والے پائپ کے گرد چکر لگا رہے تھے۔ پھر وہ تین مختلف سمتوں میں گرے اور چٹانیں زبردست دھماکے سے پھٹیں۔ چٹانوں کے ہزاروں ٹکڑے مختلف سمتوں میں تیروں اور بھالوں کی طرح اچھلے اور سیکڑوں چیخیں فضا کو ہلا گئیں۔ جو لوگ ابھی تک پناہ نہیں لے پائے تھے، ان میں سے بہت سے نوکیلے پتھروں کا شکار ہو گئے۔

اب نہ جانے کتنے آدمی مچھلی کی طرح تڑپ رہے تھے اور وہ سب بے بسی سے انہیں تڑپتے دیکھ رہے تھے۔ ان کے رنگ سفید پڑ گئے... حربہ پھر ناکام ثابت ہو گیا۔ اب پہاڑی پر حملہ آور ہونے کی بجائے ان لوگوں کو لاشوں کی پڑی ہوئی تھی۔ طیاروں کو فوراً ہدایات دی گئیں کہ مزید بمباری نہ کریں۔ وہ اڑتے ہوئے واپس آئے اور پھر بم گرائے بغیر چلے گئے

کمانڈراں چیف نے آخر اعلان کیا کہ شام سات بجے ٹی وی کا پروگرام سننے کے بعد میٹنگ ہوگی اور اس میٹنگ میں ہر محکمے کے افسر شامل ہوں گے۔

ٹھیک سات بجے ٹی وی پر سے پروگرام کی تصویر غائب ہو گئی اور سائنس دان کی تصویر آ گئی۔ اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ تھی جس سے فتح کا احساس ہو رہا تھا... پھر اس کے لب ہلے:

"میری قوم کے لوگو — آج میں پہلے آپ کو اپنا نام بتاؤں گا... کیوں کہ رعایا کو ان کے صدر کا نام معلوم ہونا چاہیے۔ مجھے ڈاکٹر کیکاؤس کہتے ہیں۔ میں اس ملک کا نیا حاکم ہوں — میں نے کل ہی واضح کر دیا تھا کہ اب سابقہ صدر اور وزیر اعظم کی کوئی اہمیت نہیں رہی... باقی دوسرے لوگ اپنا اپنا فرض انجام دیتے رہیں، لیکن میری ہدایات کے باوجود میرے صدر مقام پر حملہ کیا گیا۔ آپ دیکھ ہی چکے کہ کس قدر جانی نقصان ہوا۔ میں امید کرتا ہوں کہ آئندہ اس قسم کی بے وقوفانہ حرکت نہ کی جائے گی۔ میں نے کل سابق صدر اور وزیر اعظم کو ہدایت کی تھی کہ وہ صدر مقام کی بجائے اپنے ذاتی گھروں میں چلے جائیں، لیکن انہوں نے بھی میری ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ میں انہیں چوبیس گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں — چوبیس گھنٹے کے بعد بھی

اگر انہوں نے سرکاری رہائش کو نہ چھوڑا تو میں انہیں دھوئیں میں تبدیل کر دوں گا — اعلان ختم ہوا۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی تصویر غائب ہو گئی اور ٹی وی کا اصل پروگرام سکرین پر شروع ہو گیا۔ وہ سب سکتے کے عالم میں یہ تقریر سن رہے تھے... آخر ٹی وی بند کر دیا گیا اور میٹنگ شروع ہوئی۔ آئی جی صاحب نے انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق اور فرزانہ کو بھی شریک ہونے کی ہدایت کی تھی... انسپکٹر جمشید اپنے ساتھ خان رحمان کو بھی لے آئے تھے۔ اگرچہ ان کی سرکاری حیثیت کچھ نہیں تھی، تاہم انہوں نے ملک اور قوم کے لیے بہت کچھ کیا تھا... اس لیے اس بات کا امکان نہیں تھا کہ ان کی شرکت پر کوئی اعتراض اٹھائے گا... میٹنگ کی صدارت نائب وزیر اعظم کر رہے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس سائنس دان کو کس طرح ختم کیا جائے... کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ سب نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق مشورے دیے۔ لیکن کسی کا مشورہ بھی پسند نہیں کیا گیا۔ آخر آئی جی صاحب اٹھ کر نائب وزیر اعظم کے پاس گئے اور ان کے کان میں کچھ کہا۔ ان کی آنکھوں میں امید کی کرن چمکی اور انہوں نے کہا:

"کیا یہاں انسپکٹر جمشید بھی تشریف رکھتے ہیں؟"

"جی ہاں — میں موجود ہوں۔" انسپکٹر جمشید نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے پہاڑی پر حملہ کرنے کی مخالفت کی تھی۔"

"جی ہاں — میں پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ حملہ کرنے میں سراسر نقصان ہو گا۔"

"تو پھر — آپ کوئی مشورہ دے سکتے ہیں ... آخر ہم کیا کریں۔"

"فی الحال اس کا ہر حکم مانا جائے، ورنہ ہماری مشکلات اور پریشانیاں بڑھ جائیں گی۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے ... صاحب صدر اور وزیر اعظم کس طرح اپنے گھروں کو جا سکتے ہیں ... وہ ہرگز اسے پسند نہیں کریں گے۔"

"تو پھر وہ انہیں غائب کر دے گا۔ اس سے کیا فائدہ ہو گا۔" انسپکٹر جمشید بولے:

"کچھ بھی ہو — کم از کم اس کا یہ حکم نہیں مانا جا سکتا۔"

"ٹھیک ہے — آپ بہتر سمجھتے ہیں ... میں نے جو مشورہ مناسب سمجھا، دے دیا۔"

"ہوں — ٹھیک ہے — آپ تشریف رکھیں۔"

دو گھنٹے کی بحث کے بعد بھی کسی نتیجے پر نہ پہنچا جا سکا اور یہ میٹنگ برخاست ہوئی۔

دوسرے روز شام کے وقت پورے شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ یہ خبر بچے بچے کی زبان پر تھی کہ صدر صاحب اور وزیر اعظم صاحب غائب ہو گئے ہیں۔

مضمون پڑھ لو

پورا ملک عجیب و غریب حالات کا شکار تھا۔ ایک شیطانی ذہن نے سب کا سکون لوٹ لیا تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ کیا وہ ذہن واقعی ان سب پر حکومت کرے گا اور وہ اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔ صدر اور وزیر اعظم کے بعد اب نائب وزیر اعظم ہی تھے جو اس کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکتے تھے ... لیکن سب سے بڑا سوال تو یہ تھا کہ کیا کیا جائے .... اس تک کیسے پہنچا جائے ... دن ایک ایک کر کے گزرتا جا رہا تھا لوگوں کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی ... دفتروں میں سارا سارا دن کوئی کام نہ ہوتا، بس اسی موضوع پر باتیں ہوتی رہتیں ... ادھر محمود، فاروق اور فرزانہ بہت بور ہو رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اب تک انہوں نے اس کیس میں ایک تیر بھی نہیں چلایا ... انسپکٹر جمشید کو سب سے زیادہ پروفیسر داؤد کا فکر تھا اگر ڈاکٹر کیکاؤس نے انہیں غائب نہ کیا ہوتا تو اس وقت تک انسپکٹر جمشید ان کی ہدایات کی روشنی میں نہ جانے کیا کچھ کر چکے ہوتے۔ وہ بار بار سائنسدان کو تسلی دینے جاتے اور پریشان لوٹ آتے۔ انہیں پریشان دیکھ کر محمود،

فاروق، فرزانہ اور بیگم جمشید بھی پریشان ہو جاتے۔ کیوں کہ انسپکٹر جمشید تو وہ آدمی تھے جنھوں نے شکست کھانا سیکھا ہی نہ تھا۔ دوسری طرف ڈاکٹر کیکاؤس ہر روز شام کو سات بجے عوام سے خطاب کرتا انہیں ہدایات دیتا۔ نہ جانے وہ کیا چاہتا تھا... پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھ کر اسے حکومت کرنے کا کیا فائدہ تھا۔ کیا وہ لوگوں کو صرف اپنا غلام بنانے میں خوشی محسوس کرتا تھا...

ایک روز شام کے وقت انسپکٹر جمشید بے چینی کے عالم میں گھر کے صحن میں ٹہل رہے تھے اور محمود، فاروق اور فرزانہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ فرزانہ کہہ رہی تھی:

"میرا خیال ہے کہ ہمیں اس کیس کا جائزہ بھی عام کیسوں کی طرح لینا چاہیے... دراصل ہمارے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ ہمارا مقابلہ ایک بڑے سائنس دان سے ہے۔ ابا جان کیا آپ اس تصویر کو بھول گئے... جو پروفیسر ذاکر کے ہاں آپ کو نظر آئی تھی... وہ پروفیسر ذاکر کا دوست تھا اور اچانک کہیں غائب ہو گیا تھا۔ تاہم اس کے بارے میں اور کچھ معلوم نہیں کر سکتے۔"

فرزانہ نے اچھی بھلی تقریر کر ڈالی۔

"اوہ... فرزانہ — تمھاری زبان ہے یا کیا... رکنے کا نام ہی نہیں لیتی، دیکھتی نہیں ابا جان کچھ سوچ رہے ہیں۔"

"اوہ... نہیں فاروق... ایسا نہ کہو — فرزانہ نے اس وقت

جو بات کہی ہے، وہ اس کیس میں سب سے پہلی اور سب سے بڑی بات ہے۔ فرزانہ نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ ہم ذہنی طور پر شکست کھا چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ذہن ناکارہ ہو گئے ہیں... لیکن اب میں واقعی ایک بار پھر اس تصویر کو دیکھنے جاؤں گا... اور اس کے بعد ہم مرزا آباد جائیں گے، کیوں کہ میرا خیال ہے۔ اس تصویر سے ملتا جلتا آدمی میں نے وہیں کہیں دیکھا ہے۔"

یہ کہتے ہی انسپکٹر جمشید چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ وہ بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پروفیسر ذاکر کو ان کی دوبارہ آمد پر بہت حیرت ہوئی اور یہ سن کر تو ان کی حیرت کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا کہ انسپکٹر جمشید صرف اس تصویر کو دیکھنے آئے ہیں۔

"آپ کے پاس اپنے دوست کی کوئی اور تصویر نہیں ہے چھوٹے سائز کی؟" انھوں نے کہا۔

"آخر بات کیا ہے؟" پروفیسر ذاکر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"شاید میں آپ کے دوست کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔" انھوں نے کہا۔

"میں دیکھتا ہوں — میرا خیال ہے، میرے البم میں اس کی ایک تصویر تھی تو سہی۔"

"تو پھر ذرا جلدی کریں۔" انھوں نے بے چین ہو کر کہا۔

پروفیسر ذاکر ڈرائنگ روم سے چلے گئے اور پھر پندرہ منٹ

بعد لوٹے۔ ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹے سائز کی تصویر تھی۔ اس تصویر اور دیوار پر لگی تصویر میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ۔ ۔ انھوں نے پروفیسر کا شکریہ ادا کیا اور وہ باہر نکل آئے۔

اب ان کی کار مرمر آباد کی طرف جا رہی تھی خان رحمان نے کچھ دنوں کے لیے انہیں دے دی تھی تاکہ وہ اس کیس کے سلسلے میں مرمر آباد آ اور جا سکیں۔ ۔ ۔ مرمر آباد میں شاہد منیر کی کوٹھی کے پاس رک کر انھوں نے ایک راہگیر کو روکا اور بولے:

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ڈاکٹر شیفرڈ کا کلینک کہاں ہے؟"

"ڈاکٹر شیفرڈ۔" راہگیر کے ساتھ ہی محمود، فاروق اور فرزانہ کے منہ سے بھی نکلا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے والد ڈاکٹر شیفرڈ کے پاس آئے ہیں۔

راہگیر کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے وہ ڈاکٹر شیفرڈ کی کوٹھی کے سامنے پہنچ گئے۔ انسپکٹر جمشید نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ ایک ملازم نے دروازہ کھولا، پھر اس نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور ڈاکٹر کو اطلاع دینے چلا گیا۔ ۔ ۔ جلد ہی ڈاکٹر اندر داخل ہوا مگر سامنے ہی رک گیا۔ ۔ ۔ اس کے چہرے پر حیرت تھی:

"میں آپ لوگوں کو کہیں دیکھ چکا ہوں۔"

"جی ہاں! شاہد منیر کے ہاں آپ سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ۔ ۔ اور یہ وہ وقت تھا جب شاہد منیر دھوئیں میں تبدیل ہوا تھا۔" انسپکٹر

جمشید نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ان کے ساتھ وہ تینوں بھی اٹھ بیٹھے۔

"اوہ یہ ۔ ۔ بھی" یہ ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا، پھر آگے بڑھ کر ان سے ہاتھ ملایا۔

"ہم دراصل ملک کو درپیش مسئلے پر بات کرنے آئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونکا۔

"میرا مطلب پروفیسر کیلاؤس سے ہے، آخر ہم اس کا مقابلہ کس طرح کریں۔ ۔ ۔ اس کے ٹھکانے کو کس طرح تباہ کریں۔ ۔ ۔ آپ ٹی وی پر اسے دیکھ ہی چکے ہوں گے۔ اخبارات پڑھتے ہی رہتے ہوں گے۔"

"جی ہاں۔ میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ لیکن آپ میرے پاس کیوں آئے۔ میں تو صرف ایک ڈاکٹر ہوں۔ اور اس طرح کے لیے تو آپ کو کسی سائنس دان کے پاس جانا چاہیے تھا۔"

"مجھے کسی نے بتایا تھا کہ آپ نے بھی سائنس کی تعلیم حاصل کی ہے۔"

"نہیں جناب۔ کسی نے آپ کو غلط بتایا ہے۔"

"اوہ۔ پھر تو ہم نے آپ کو بلاوجہ زحمت دی۔ تو پھر اجازت دیجیے۔"

وہ باہر نکل کر کار میں بیٹھ گئے اور واپس شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ چاروں خاموش تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر شیفرڈ کو اس دوران بغور دیکھا تھا۔ ۔ ۔

"کیا خیال ہے ابا جان!" فرزانہ نے پوچھا۔

"مجھے یقین ہے... پروفیسر ذاکر کا دوست بھی ڈاکٹر شیفرڈ [illegible]

"ہمارا بھی یہی خیال ہے — اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ڈاکٹر [illegible] خود کو غائب کیوں کر رکھا ہے — اس نے اپنے حلیے میں بھی تبدیلی کر رکھی ہے — اگر اس کی ڈاڑھی صاف کر دی جائے تو اسے فوراً پہچانا جا سکتا ہے ویسے پروفیسر ذاکر اسے اس روپ میں بھی فوراً پہچان سکتا ہے۔" محمود نے کہا۔

"ہوں — تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ اس کیس سے ڈاکٹر شیفرڈ یا شبیر نواز کا کیا تعلق ہے۔ یہی نام بتایا تھا پروفیسر ذاکر نے اپنے دوست کا۔"

"جی ہاں۔"

"تو پھر — اب تمہیں یہ سوچنا ہے کہ اس کا اس کیس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔"

"جی بہت اچھا... ہم سوچیں گے..."

"اور ہاں — ہمیں کل رات مرمر آباد کی پہاڑیوں پر بھی چڑھنا ہے۔" وہ بولے۔

"جی — کیا مطلب؟" تینوں ایک ساتھ چونکے۔

"ہاں — ہم یہ کام کسی کو بتائے بغیر کریں گے۔ کیونکہ شاید ہمیں اس کی اجازت نہ ملے۔"

"لیکن... لیکن ہم اس [illegible] کو کیسے ہٹائیں گے؟" فاروق کے [illegible] سے نکلا۔

"[illegible] یہی تو دیکھنا ہے... بہرحال تم اس سلسلے میں کیا کرتے ہو — تم نے [illegible] ک اس کیس میں کچھ نہیں کیا۔ لیکن اب میں تمہیں پوری آزادی [illegible] کام کرنے کی اجازت دیتا ہوں... کیونکہ اس وقت پورا ملک [illegible] دست الجھن کا شکار ہے، الجھن کے اس عالم میں اگر کسی دشمن [illegible] نے حملہ کر دیا تو ہم کیا کریں گے... سوائے شکست کھانے کے اور کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔"

"اوہ — تو کیا یہ سائنس دان ڈاکٹر کیکاؤس یہی چاہتا ہے؟"

"ہاں — شاید!"

انسپکٹر جمشید نے کہا اور وہ دھک سے رہ گئے — واقعی اس صورت میں زبردست قسم کی شکست ہو سکتی تھی۔ صدر صاحب اور وزیر اعظم صاحب غائب تھے۔ ایسی صورت میں انتظامی ڈھانچہ درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔

انھوں نے محسوس کیا... پورا ملک ایک خوفناک خطرے کی لپیٹ میں تھا۔

وہ گھر آ گئے۔ انسپکٹر جمشید اپنی لائبریری میں گھس گئے...

وہ دیوانوں کی طرح رسالوں پر رسالے ڈھیر کرنے لگے۔ نہ جانے
انہیں کس رسالے کی ضرورت تھی۔ وہ انہیں حیرت بھری نظروں سے
دیکھ رہے تھے۔ آخر پون گھنٹے کی محنت کے بعد وہ ایک رسالے
کو دیکھ کر کھل اٹھے۔ پھر وہ قالین پر بیٹھ کر ہی اسے بغور پڑھنے لگے
وہ تینوں بھی اس رسالے پر جھک گئے۔ لیکن انسپکٹر جمشید نے انکار میں
سر ہلا کر انہیں باہر جانے کا اشارہ کیا۔ تینوں باہر نکل گئے۔
ان کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

”آخر اس رسالے میں کیا ہے؟“ محمود بڑبڑایا۔

”کوئی مضمون۔“ فاروق بولا

”یہ تو ہم بھی سمجھتے ہیں۔ تم نے کوئی نئی بات نہیں بتائی۔“

”چلو نئی بات تم بتا دو۔“ فاروق مسکرایا۔

”اس میں ضرور کوئی ایسا مضمون ہے جس میں اس کے [illegible]
اس کیس پر روشنی پڑتی ہو گی۔“ محمود بولا۔

اچانک لائبریری کا دروازہ کھلا اور انسپکٹر جمشید باہر نکل آئے۔
ان کا چہرہ دیکھ وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ وہ بے حد خوش تھے اور
پر جوش بھی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے رسالہ ان کی طرف بڑھا دیا

”صفحہ ایک سو چار کا مضمون پڑھ لو۔“

انہوں نے بے چینی کے عالم میں صفحہ ایک سو چار کھولا اور یہ دیکھ
کر بھونچکے رہ گئے کہ مضمون ڈاکٹر شیفرڈ کا لکھا ہوا تھا۔

ڈاکٹر شیفر کا

ڈاکٹر شیفرڈ کا مضمون پڑھتے ہوئے ابھی انہیں چند منٹ
نہیں گزرے تھے کہ بیگم شیرازی اندر داخل ہوئیں۔ انہوں نے
انسپکٹر جمشید سے کہا:

”آپ کا فون ہے۔ آئی جی صاحب بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”اوہ... اچھا۔“

وہ تیز تیز قدم اٹھاتے باہر نکل گئے۔ تھوڑی دیر بعد واپس
آئے تو ان کا چہرہ بہت سنجیدہ تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جو خوشی نظر
آ رہی تھی، اب وہ نہ جانے کہاں پر لگا کر اڑ گئی تھی۔ انہوں نے تینوں
کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

”یہ مضمون بعد میں پڑھ لینا۔ آئی جی صاحب نے فوراً بلایا ہے
وہ بھی نائب وزیراعظم کے بنگلے پر۔“

”اوہ۔“ وہ دھک سے رہ گئے۔ پھر فرزانہ نے پوچھا۔

”کیا بلانے کی وجہ بھی بتائی ہے؟“

”نہیں۔ لیکن انہوں نے کہا ہے کہ معاملہ بہت خطرناک ہے۔“

”تو پھر چلیے... شاید اس مرتبہ ہم ادھر سے ادھر آنے جانے

کے سوا کچھ بھی نہیں کر پائیں گے۔" محمود نے کہا۔

ایک بار پھر وہ کار میں بیٹھے برق رفتاری سے اڑے جا رہے تھے، جلد ہی نائب وزیر اعظم کے بنگلے پر پہنچ گئے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس وقت وہاں آئی جی صاحب، نائب وزیر اعظم صاحب اور کمانڈر انچیف کے علاوہ اور کوئی بھی نہیں تھا۔

"آؤ جمشید، ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔" آئی جی بولے۔

"خیر تو ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"خیر ہی تو نہیں ہے... ہماری سرحدوں پر دشمن ملک کی فوجوں میں نقل و حرکت کے آثار پائے گئے ہیں۔ چند دن میں ان کی تعداد بھی بہت زیادہ کر دی گئی ہے۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ بھی دنگ رہ گئے، کیوں کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو ان کے والد کو خیال آیا

"اب ان حالات میں... جب کہ صدر صاحب اور وزیر اعظم صاحب بھی غائب ہیں اور ملک اس سائنس دان کی وجہ سے الجھن میں پھنسا ہوا ہے... صورتِ حال بہت نازک ہو گئی ہے۔ تمھیں اس لیے بلایا ہے کہ کم از کم اس سائنس دان کا کچھ ہو جائے۔"

"آپ کے خیال میں اس کے خلاف کیا کارروائی کی جا سکتی ہے؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"میری تو عقل حیران ہے... میں باگ ڈور تمھیں سونپتا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے، آپ مجھے مکمل اختیار دے رہے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں، جو تمہارے جی میں آئے کر سکتے ہو۔" آئی جی بولے۔

"میری طرف سے بھی اجازت ہے... اور مجھے اس بات پر بھی بہت افسوس ہے، سائنس دان کے خلاف کارروائی کرتے وقت تمہارے مشورے کو قبول نہیں کیا گیا۔" نائب وزیر اعظم بولے۔

"کوئی بات نہیں جناب والا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ "اب میں ڈاکٹر کیکاؤس کو دیکھ لوں گا۔"

"کیا تمہارے ذہن میں کوئی پلان ہے۔ کوئی ترکیب ہے؟"

"جی نہیں۔ لیکن آپ فکر نہ کریں۔"

"ہمیں تم پر پورا پورا بھروسہ ہے۔ شاید اس ملک میں تمہارے سوا کوئی ایسا نہیں جو ہمیں اس کیفیت و صورت سے نکال سکے۔"

"اللہ مالک ہے۔ البتہ میں آپ کو یہ ضرور بتانا چاہتا ہوں کہ دشمن ملک پروفیسر کیکاؤس کے اشارے پر ہی اپنی فوجیں آگے لا رہا ہے۔"

"کیا مطلب؟" کمانڈر انچیف اور دوسرے زور سے اچھلے۔

"جی ہاں۔ یہ سب ملی بھگت سے ہو رہا ہے... بلکہ میں تو یہاں تک کہنے پر تیار ہوں کہ ڈاکٹر کیکاؤس کا ٹھکانا دشمن ملک کے کاریگروں کی مدد سے ہی پہاڑ کی چوٹی پر بنوایا گیا ہے۔"

"اوہ!"

ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

رات تاریک تھی۔ مرم آباد کی پہاڑیاں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ایسے میں پانچ سائے ان پہاڑیوں کی طرف بڑھ رہے تھے... ان میں سے ایک کہہ رہا تھا:

"اس کیس میں اب تک تم نے کچھ نہیں کیا۔ اب کام کرنے کا وقت آگیا ہے۔ معلوم ہو جائے گا، تم میں کتنی صلاحیتیں ہیں۔" یہ انسپکٹر جمشید کی آواز تھی۔

"فکر نہ کریں ابا جان — ہم خود کچھ نہ کچھ کرنے کے لیے بے چین ہیں۔" یہ محمود کی آواز ابھری۔

"آہستہ بات کرو... سرگوشی سے زیادہ اونچی آواز نہ ہو... اگر بھنک اس کے کانوں میں پڑ گئی تو ہم کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تو کیا وہ جاگ رہا ہوگا؟"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

"یار جمشید... تم مجھے کیوں ساتھ لائے ہو۔ مجھے پہاڑیوں پر چڑھنا نہیں آتا۔" یہ خان رحمان کی آواز تھی۔

"تم ہی نے تو کہا تھا کہ جب تک پروفیسر داؤد نہیں ملتے، تم اس مہم میں ہمارے ساتھ رہو گے۔"

"اوہ ہاں — یاد آیا۔ لیکن میں پہاڑیوں پر کیسے چڑھوں گا..."

"جیسے ہم چڑھیں گے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"تم لوگوں کو تو عادت ہے۔"

"تم بھی تو ریٹائرڈ فوجی ہو — کیا فوج میں رہتے ہوئے پہاڑیوں پر کبھی نہیں چڑھے۔"

"وہ اور زمانہ تھا۔ اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔"

"چھوڑو یار — مذاق نہ کرو۔" انسپکٹر جمشید دھیرے سے ہنسے۔

"مذاق اس لیے کر رہا ہوں کہ فاروق مذاق کرنا بھول گیا ہے... جب کہ میں اسے ہر حال میں چہکتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔" خان رحمان کی سرگوشی فاروق نے بھی صاف سنی۔

"لیکن انکل میں چڑیا تو نہیں ہوں۔" اس نے کہا

"ہاں! یہ ہوئی نا بات — اگر تم اسی طرح چہکتے رہے تو میں پہاڑ تو کیا، آسمان پر بھی چڑھ جاؤں گا۔"

"خدا نہ کرے، آپ آسمان پر چڑھیں..." فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

"جی ہاں... کیوں کہ اگر آسمان سے گر پڑے تو کھجور میں اٹکنا پڑے گا، ورنہ محاورہ غلط ثابت ہو جائے گا۔" فاروق بولا۔

"لیجیے — چل پڑی زبان — ذرا اشارہ کرنے کی دیر تھی۔" محمود نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"دیکھا انکل۔۔۔ میں اسی لیے نہیں بول رہا تھا۔"

"اچھا بھئی اب گفتگو کا سلسلہ بند۔۔۔ کیونکہ یہاں سے چڑھائی کا کام شروع ہوتا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"یعنی چہکنا بند۔" فرزانہ مسکرائی۔

"یار جمشید۔۔۔ تم یہ کام دن میں نہیں کر سکتے تھے۔" خان رحمان بولے۔

"دن میں پہاڑی عمارت تک پہنچنا ناممکن تھا۔" انہوں نے جواب دیا۔

"لیکن یہ تو سوچو۔۔۔ ان پہاڑوں پر تو لوگ دن کی روشنی میں چڑھتے ہوئے ڈرتے ہیں۔۔۔ اور تم ہمیں رات کے وقت چڑھنے کی دعوت دے رہے ہو۔"

"دعوت بعد میں دوں گا — پہلے اوپر پہنچ کر تو دکھاؤ — کیا پروفیسر داؤد کو نہیں بچانا چاہتے۔۔۔ ملک کو خطرے سے نکالنے کا ارادہ نہیں ہے۔"

"نہیں تو — یہ دونوں ارادے تو بہت نیک ہیں۔"

"تو پھر بسم اللہ کرو۔ میرے پاس پنسل ٹارچ ہے — سب سے آگے میں چلوں گا۔"

"ارے تو پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔" خان رحمان خوش ہو کر بولے۔

اور وہ مسکرا کر رہ گئے۔

وہ اوپر چڑھنے لگے۔ ایک ایک انچ کر کے چڑھتے چلے گئے۔ ایسے میں ان میں سے کسی کا پاؤں غلط جگہ پر پڑنے کی دیر تھی کہ وہ سینکڑوں فٹ گہری کھائی میں جا گرتا اور اس کی ہڈیاں بھی سرمہ بن جاتیں۔۔۔ لیکن یہ ٹیم بھی کوئی معمولی آدمیوں کی ٹیم نہیں تھی۔ انہوں نے ایسے کام نہ جانے کتنی مرتبہ کیے تھے۔

گھر سے چلتے وقت انسپکٹر جمشید نے انہیں ربڑ کے جوتے پہننے کی ہدایت کی تھی اور اب یہی ربڑ کے جوتے ان کے کام آ رہے تھے۔۔۔ ورنہ اس وقت انہیں سخت دشواری ہوتی۔ آخر خدا خدا کر کے وہ اس دیوار تک پہنچ گئے جو بہت مشکل سے نظر آ رہی تھی اور بظاہر شیشے کی تھی، لیکن اگر وہ شیشے کی ہوتی تو بندوق کے بٹوں سے ٹوٹ نہ گئی ہوتی۔

"اب آپ کیا کریں گے؟"

"اس دیوار کو توڑوں گا — کم از کم اتنے چھید کہ ہم اندر داخل ہو سکیں۔" وہ بولے۔

"لیکن کیسے توڑیں گے۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"شاید تم رسالے کا وہ مضمون پڑھنا بھول گئے تھے۔"

"اوہ۔۔۔ ارے — وہ — ہاں واقعی۔۔۔ وہ تو ذہن سے نکل گیا تھا۔"

ہم آپ کے ساتھ نائب وزیر اعظم کے ہاں جو چلے گئے تھے۔"

"اسی لیے تم پوچھ رہے ہو... کہ دیوار کیسے توڑوں گا۔ سنو... ڈاکٹر شیفرڈ نے آج سے گیارہ بارہ سال پہلے اس رسالے میں مضمون لکھا تھا... اس مضمون کی رو سے ایک دیوار بنائی جا سکتی ہے جس پر بم، گولی اور اس قسم کا کوئی بھی ہتھیار کام نہ کرے۔ اس وقت اس کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ خود اسے اس قسم کی دیوار بنانی پڑے گی۔ لیکن میں مضمون بارہ سال پہلے پڑھ چکا تھا اور ایک دھندلا سا خاکہ میرے ذہن میں موجود تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس رسالے کو تلاش کر رہا تھا۔ اور اب میں جانتا ہوں کہ اس دیوار میں سوراخ کیسے کیا جا سکتا ہے۔"

"اوہ!" وہ حیرت زدہ رہ گئے۔

اتنے میں انسپکٹر جمشید اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکال چکے تھے۔ اس میں کوئی محلول تھا۔ انہوں نے کہا۔

"یہ چند تیزابوں کا مرکب ہے۔ میں اس کا صرف ایک قطرہ اس دیوار پر گراؤں گا اور دیکھوں گا کہ اس کا کیا عمل ہوتا ہے۔"

دیوار میں یک دم تین فٹ شگاف سا پڑ گیا۔ انہیں یوں لگا جیسے وہ حصہ ہوا بن کر اڑ گیا ہو۔

"کیا خیال ہے... کیا اس سوراخ سے گزر سکو گے یا ایک قطرہ اور گراؤں؟" انہوں نے انسپکٹر جمشید کی چہکتی ہوئی آواز سنی۔

خان رحمان کی چیخ

"جی نہیں، یہ جگہ کافی ہے... ہم گزر جائیں گے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا پروفیسر کیلاؤس کو اس شگاف کے پڑنے کی خبر نہ ہوئی ہوگی جب کہ اسے ہر بات کا پتہ چل جاتا ہے۔"

"اگر ہم نے یہ کام روشنی کے وقت کیا ہوتا تو یقیناً اسے پتہ چل جاتا... لیکن اس وقت تو وہ سو رہا ہوگا۔" انسپکٹر جمشید نے جواب دیا۔

"تو پھر بسم اللہ کیجیے۔"

وہ ایک ایک کر کے اس شگاف میں سے گزر گئے۔ انہوں نے دیکھا... عمارت اب ان کے بالکل سامنے تھی جب کہ دیوار کے اس پار یہ بہت دور معلوم ہوتی تھی۔

"بہت خوب! ہم تو پہنچ گئے۔"

"خاموش! اب کسی کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلے۔"

"کیا تم اسے سوتے میں گرفتار کرنا چاہتے ہو؟" خان رحمان نے حیران ہو کر پوچھا۔

"نہیں... میں پہلے اس کے پاس پہنچنا چاہتا ہوں۔ اگر

وہ جاگ گئے تو یہ عمارت پاس ہوتے ہوئے بھی بہت دور ہو جائے گی اور پھر شاید ہم کبھی بھی اس تک نہ پہنچ سکیں۔" وہ کہتے چلے گئے۔

"ٹھیک ہے۔ ہم سمجھ گئے۔"

وہ دبے پاؤں اوپر ہی اوپر چڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ایک ہموار میدان تک پہنچ گئے۔ اسی میدان پر وہ عمارت بنی ہوئی تھی... اور اس وقت انہوں نے دیکھا... یہ واقعی پہاڑ کو کاٹ کر بنائی گئی تھی اور اس کے لیے یقیناً سائنسی آلات استعمال کیے گئے ہوں گے۔ عمارت کا دروازہ بند تھا... انہوں نے دباؤ ڈال کر دیکھا اور پھر مایوس ہو گئے... دروازے پر زور آزمائی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا... وہ تو نہایت خاموشی سے اندر داخل ہونا چاہتے تھے۔

انسپکٹر جمشید نے چکر لگا کر عمارت کا جائزہ لینے کا اشارہ کیا۔ اور وہ دونوں عمارت کی دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ چکر کاٹ کر واپس آئے تو محمود نے کہا:

"لوہے کا ایک پتلا سا پائپ عمارت کی چھت تک چلا گیا ہے پتہ نہیں وہ کس غرض کے لیے لگایا گیا ہوگا۔"

"اس وقت ہمیں اس سے غرض نہیں کہ وہ کس مقصد کے لیے لگایا گیا ہے۔ چلو فاروق... کام کرنے کی باری تمہاری ہے —

چھت پر پہنچ کر نیچے اترو اور دروازہ کھول دو۔" انسپکٹر جمشید نے دبی آواز میں کہا۔

"جی بہت بہتر۔"

فاروق نے کہا اور پائپ کی طرف چل پڑا۔ باقی لوگ بھی اس کے پیچھے تھے۔ دوسرے ہی لمحے فاروق بندروں کی سی پھرتی اور جوش سے اوپر چڑھ رہا تھا کوئی اور موقع ہوتا تو فرزانہ اور محمود اس کا مذاق اڑائے بغیر نہ رہتے، مگر اس وقت تو اس کی اجازت ہی نہیں تھی... اور پھر فاروق چھت پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

ان کے دل دھک دھک کرنے لگے... کیوں کہ فاروق اب دشمن کے ٹھکانے کے اندر پہنچ چکا تھا۔ جب کہ وہ ابھی باہر موجود تھے۔ وہ انتظار کرتے رہے۔ ان کی بے چینی بڑھتی گئی۔ وہ فاروق کے بارے میں فکر مند تھے — اچانک دروازہ آواز پیدا کیے بغیر کھل گیا اور انہیں فاروق کا دھندلا دھندلا سا چہرہ دکھائی دیا۔ ان کے دل خوشی سے بھر گئے... ہر قدم پر کامیابی ان کے قدم چوم رہی تھی۔

وہ اندر داخل ہوئے... یہاں بھی گھپ اندھیرا تھا، انسپکٹر جمشید نے پنسل ٹارچ روشن کر لی اور اس کی مدد سے آگے بڑھنے لگے، وہ ایک صحن میں سے گزر رہے تھے۔ صحن کے چاروں طرف

کمرے نظر آ رہے تھے اور ہر کمرے کے ساتھ ایک ایک روشن دان
کی قسم کے مستطیل سوراخ تھے... جو اس روز انہیں روشن دان
معلوم ہوئے تھے..... لیکن اس وقت ان سوراخوں میں پروفیسر
کیکاؤس کا کوئی ساتھی نہیں تھا۔ وہ کمروں کے پاس پہنچ گئے...
اچانک وہ اُچھل پڑے۔

پوری عمارت ایک تیز روشنی میں نہا گئی تھی... اور روشنی
نے انہیں گھیرے میں لے لیا تھا۔

"بہت خوب! تو تم یہاں تک پہنچ چکے ہو۔ چلو یہ اچھا ہی ہوا
میرے راستے کا سب سے بڑا کانٹا نکل جائے گا۔ تمہارے بعد
کون ہے جو یہاں تک پہنچ سکے؟" پروفیسر کیکاؤس کی آواز گونجی۔

"تمہارا خیال غلط ہے۔ اس دنیا میں اللہ نے ایک سے بڑھ کر ایک
پیدا کیا ہے... اگر ہم نہ ہوں گے تو اور بہت سے ہم جیسے ہوں
گے... شاید تم نہیں جانتے... ہمارے ملک میں ہم جیسی ہی
شہرت رکھنے والے بھی کچھ لوگ ہیں... ان میں سے ایک تو
انسپکٹر کامران مرزا اور ان کے بچے ہی ہیں،" انسپکٹر جمشید کہتے
چلے گئے۔

"خیر انہیں بھی دیکھ لوں گا۔"

"تم ہو کہاں۔ سامنے کیوں نہیں آتے؟"

"ضرور آؤں گا۔ اس بنگلے کے ساتھ ایک کمرے کا دروازہ

کھلا اور انہوں نے دیکھا... ان کے سامنے وہی شخص کھڑا تھا جو
ٹیلی ویژن پر انہیں دکھائی دیتا رہا تھا۔

"بہت خوب۔ تو تم پروفیسر کیکاؤس ہو۔"

"ہاں۔ اب تم یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتے۔" پروفیسر بولا۔

"خدا ہی بہتر جانتا ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ویسے میں حیران ہوں... تم نے دیوار کو کیسے توڑا؟"

"چند تیزابوں کی مدد سے۔ دراصل میری یادداشت اتنی کمزور
نہیں... بارہ سال پہلے تم نے ایک سائنسی رسالے میں مضمون لکھا تھا۔
بس اس مضمون کو پڑھ کر میں جان گیا کہ ہم کس طرح یہاں آ سکتے
ہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"اوہ۔ واقعی تم بہت چالاک ہو۔ مگر آج تمہاری چالاکی کا
آخری دن ثابت ہوگا۔" یہ کہہ کر اس نے تالی بجائی۔ فوراً ہی
دوسرے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس میں سے پانچ آدمی عجیب وضع
قسم کے پستول لیے باہر نکلے... لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا....
دروازے میں ہی ڈھیر ہو گئے۔ وہ چیخ بھی نہ سکے۔ پروفیسر
نے چونک کر انہیں دیکھا اور تیزی سے انسپکٹر جمشید کی طرف مڑا۔

"تم نے انہیں کس چیز سے ہلاک کیا۔ میں نے فائر کی آواز
نہیں سنی۔ نہ ہی تمہارے ہاتھ جیبوں میں ہیں۔" اس کے لہجے میں
بلا کی حیرت تھی۔

"ہمارے ابا جان کالا جادو جانتے ہیں" فاروق بول اٹھا۔

"تم بھی میری زد پر ہو، حرکت کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ کیا سمجھے تھے ... میں یہاں بغیر کسی انتظام کے آ جاؤں گا؟"

ان کے الفاظ ابھی ختم بھی نہ ہوئے تھے کہ پروفیسر نے پھر تالی بجائی۔ ایک اور کمرے کا دروازہ کھلا۔ اس مرتبہ پروفیسر نے دروازے کی طرف نہیں دیکھا، وہ انسپکٹر جمشید کو بغور دیکھتا رہا۔ دراصل وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ انسپکٹر جمشید انہیں کس طرح ہلاک کرتے ہیں ...

اور پھر دیکھتے دیکھتے ہی دوسرے کمرے سے نکلنے والے پانچ آدمی بھی آواز پیدا کیے بغیر ڈھیر ہو گئے۔

"میں سمجھ گیا۔" پروفیسر کیلاؤس کی آواز ابھری۔ "تم بلو پائپ سے کام لے رہے ہو... افریقہ کے باشندے اس ہتھیار سے اپنے دشمنوں کو ختم کرتے ہیں؟"

"ہاں — تمہارا خیال ٹھیک ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے ....

پروفیسر کے ساتھ محمود، فاروق، فرزانہ اور خان رحمان بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ انہیں بلو پائپ کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا۔ ایک نلکی میں زہریلی سوئیاں رکھ کر منہ سے پھونک ماری جاتی ہے ... اس طرح اس نلکی میں سے سوئیاں تیزی سے نکلتی ہیں اور سامنے والوں کے جسم کے کسی حصے میں چبھ جاتی ہیں، زہر اتنا تیز ہوتا ہے کہ مرنے والوں کے حلق سے آواز نہیں نکل سکتی۔

"میں جانتا ہوں — اس مکان میں تمہارے ساتھ صرف دس آدمی ہیں ... کیوں کہ میں روشن دانوں کی تعداد گن چکا ہوں — اس طرح اب تم تنہا رہ گئے ہو اور تم بھی زہریلی سوئی کی زد پر ہو۔ اس لیے ہاتھ اوپر اٹھا دو اور خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دو۔"

"تم بڑے شوق سے مجھ پر سوئی پھینک سکتے ہو — میں خود کو تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔"

"لیکن میں تمہیں زندہ گرفتار کروں گا۔" انسپکٹر جمشید نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"تو پھر آؤ — آگے بڑھو — تم بھی کیا یاد رکھو گے۔" پروفیسر ہنسا۔

انسپکٹر جمشید نے منہ سے ایک ربڑ کا پائپ سا نکال کر محمود کے ہاتھ میں تھما دیا اور خود بے خوف ہو کر آگے بڑھے لیکن اسی وقت خان رحمان کی آواز نے انہیں چونکا دیا:

"ٹھہرو جمشید — میں تمہارے ساتھ یونہی مارا مارا پھر رہا ہوں — کچھ مجھے بھی کرنے دو۔"

"رحمان تم ... اس کا مقابلہ نہیں کر سکو گے۔"

"بلا سے ... شکست کھا جاؤں گا ... یہ خیال تو نہیں ستائے گا کہ میں نے اپنے دوست پروفیسر داؤد کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔"

"رحمان مان جاؤ — یہ بہت خطرناک آدمی ہے — ابھی مجھے بھی نہیں معلوم ... اس سے مقابلہ کس طرح کرنا ہوگا۔"

اپنی ٹانگوں کو پوری طاقت سے گھما دیا، انسپکٹر جمشید ہوا میں اچھلتے ہوئے دیوار سے ٹکرائے۔ ان کے حلق سے ایک کرب ناک چیخ نکلی اور وہ ساکت ہو گئے...

محمود، فاروق اور فرزانہ دم بخود رہ گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ شخص اس قدر طاقت ور بھی ہو سکتا ہے۔ ان کی آنکھیں، حیرت سے... اسی وقت انھوں نے چاقو کھلنے کی خوفناک کڑاک، آواز سنی۔ پروفیسر کے ہاتھ میں ایک چمک دار چوڑے پھل والا چاقو تھا۔

اب انسپکٹر جمشید کا پیٹ میں ان کے بچوں کے سامنے چاک کروں گا، یہ کہتے ہوئے وہ انسپکٹر جمشید کی طرف بڑھا۔

فاروق اور فرزانہ اس طرح چونکے جیسے ابھی تک خواب دیکھ رہے ہوں۔

”خبردار... آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا۔“ فاروق چلایا۔

”تم اگر لوہے کے آدمی ہو تو کیا ہوا... ہم بھی فولاد کے ہیں۔“ محمود غرایا۔

”بالکل— ہماری لاشوں پر سے گزر کر ہی تم ابا جان تک پہنچ سکتے ہو۔“

خان رحمان نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا، وہ ابھی تک اپنا ہاتھ پکڑے بیٹھے تھے، اب رہ نہ سکے۔ انھوں نے وحشیوں کی طرح پروفیسر کیکاؤس پر چھلانگ لگائی... اس کی کمر سے ٹکرائے

ایک بار پھر خان رحمان کے منہ سے چیخ نکل گئی، انہیں یوں لگا تھا جیسے کسی چٹان سے ٹکرائے ہوں۔ دوسرے ہی لمحے وہ بے ہوش ہو گئے۔

پروفیسر، پھر انسپکٹر جمشید کی طرف مڑا، لیکن اب تین ننھی دیواریں اس کے راستے میں کھڑی تھیں... محمود، فاروق اور فرزانہ۔ وہ طنزیہ انداز میں ہنسا اور ان کی طرف بڑھا... خوف کھانے یا پیچھے ہٹنے کی بجائے فرزانہ اس کی طرف دوڑی۔ پروفیسر ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا کہ یہ لڑکی کیا کر رہی ہے... اتنے میں فرزانہ اس کی ٹانگوں میں سے نکلتی ہوئی اس کے پیچھے جا پہنچی، دوسرے ہی لمحے اچھلی اور پروفیسر کی کمر سے لٹک گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا لیا... پروفیسر نے ایک زور دار جھٹکا مار کر اسے الگ کرنا چاہا، مگر فرزانہ تو اس کے ساتھ کسی جونک کی طرح چپٹ گئی تھی۔

یہ دیکھ کر محمود اور فاروق تیر کی طرح آگے بڑھے اور اس کے ایک ایک ہاتھ سے لٹک گئے۔ دائیں ہاتھ سے محمود لٹکا تھا اور اس ہاتھ میں چاقو تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اپنے دانت پروفیسر کی کلائی پر جما دیے اور دباؤ ڈالتا چلا گیا... دوسرے ہاتھ سے فاروق لٹک رہا تھا، اس لیے پروفیسر اس ہاتھ کو حرکت نہیں دے سکتا تھا۔

محمود نے محسوس کیا... کہ پروفیسر کی جلد اگرچہ سخت ہے لیکن
دانت اندر کھبتے جا رہے ہیں۔ اسے اپنی اس کامیابی پر خوشی ہوئی
اس نے دانتوں پر پورا زور صرف کر دیا۔

دوسری طرف پروفیسر کے پاس اب حرکت کرنے کے لیے
صرف ٹانگیں باقی رہ گئی تھیں۔ اس نے ان سے کام لیا اور تیزی
سے چکر کاٹنے لگا۔ وہ تینوں بھی اس کے ساتھ گھومنے لگے۔
فرزانہ اپنے بازوؤں کے ذریعے پروفیسر کی گردن پر برابر دباؤ
ڈال رہی تھی۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح پروفیسر کا گلا
گھٹنا شروع ہو جائے، اس صورت میں وہ اس پر فتح حاصل کر
سکتے تھے۔ پروفیسر کے چکر کاٹنے میں بلا کی تیزی آ گئی تھی۔ ان
کے جسم تیزی کی وجہ سے فضا میں بالکل سیدھے ہو گئے تھے،
اور اب وہ زمین کے متوازی تھے۔ اگر کوئی اس منظر کو دیکھتا
تو خیال کرتا کہ شاید وہ چاروں سرکس کے کسی پروگرام کی ریہرسل
کر رہے ہیں۔

اچانک پروفیسر کے منہ سے ایک کراہ نکلی۔ اس کے ہاتھ
سے چاقو نکل گیا۔ شاید محمود کے دانت زیادہ گہرائی میں اتر گئے
تھے۔ انہیں چاقو کے گرنے کی بہت خوشی ہوئی۔ یہ پہلی فتح
تھی جو انہیں پروفیسر کے مقابلے میں نصیب ہوئی تھی۔

اب پروفیسر کو غصہ آ گیا۔ اس کی رفتار میں حیرت انگیز اضافہ

ہو گیا۔ تینوں کے لیے اب پروفیسر کے جسم سے چمٹے رہنا بہت
مشکل ثابت ہو رہا تھا... اور پھر فاروق کے ہاتھ جواب دے
گئے... وہ چکر کھاتا ہوا انسپکٹر جمشید سے ٹکرایا... انسپکٹر
جمشید ہڑبڑا کر اٹھے... جیسے اچانک ان کی آنکھ کھل گئی ہو۔
انہوں نے جو یہ حیرت انگیز منظر دیکھا تو بوکھلا اٹھے۔ ساتھ ہی ان کی
نظر نزدیک پڑے خنجر سے ٹکرائی۔ انہوں نے لیٹے لیٹے ہی چاقو
اٹھا لیا۔ فاروق بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس وقت محمود بھی دیوار سے
ٹکرایا۔ اور اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ اب صرف فرزانہ پروفیسر
کی گردن سے چمٹی رہ گئی تھی... لیکن چونکہ اب پروفیسر کے دونوں
ہاتھ آزاد ہو گئے تھے، اس لیے اس نے فرزانہ کو دبوچ لیا اور
دور اچھال دیا... ساتھ ہی وہ خنجر اٹھانے کے لیے جھکا اور
یہ دیکھ کر ٹھٹک گیا... کہ انسپکٹر جمشید خنجر دائیں ہاتھ میں لیے
کھڑے ہیں۔ فرزانہ نے بے ہوش ہوتے ہوئے دیکھا انسپکٹر جمشید
خنجر سے پروفیسر پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ اور اس کے بعد اس
کی آنکھیں بھی بند ہو گئیں۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ محمود، فاروق، فرزانہ اور خان رحمان
چاروں بے ہوش پڑے اور انسپکٹر جمشید پروفیسر سے مقابلہ کرنے
کے لیے بالکل تنہا رہ گئے تھے... ایک خوفناک سائنس دان سے
جس کا جسم لوہے کی طرح سخت تھا... لیکن وہ جانتے تھے

کہ جسم کا ایک حصہ ایسا بھی ہے... جو کسی صورت بھی پتھر کی
طرح سخت نہیں ہو سکتا اور وہ حصہ ہے آنکھیں — انہوں
نے بجلی کی سی تیزی سے خنجر سے پروفیسر کی آنکھ پر وار کیا۔ پروفیسر
ان کا مقصد سمجھ گیا — پہلی مرتبہ اس کے چہرے پر پریشانی کے
آثار نمودار ہوئے، وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ ادھر انسپکٹر جمشید آگے
بڑھے اور پھر... اچانک نہ جانے کیسے... انسپکٹر جمشید
کا خنجر والا ہاتھ کلائی پر سے پروفیسر کے ہاتھ میں آگیا۔ اس نے
ان کی کلائی کو پوری قوت سے بھینچنا شروع کر دیا... وہ کبھی ادھر
ہو رہے تھے کبھی ادھر — اس کوشش میں ایک بار ایسا ہوا کہ
پروفیسر ایک چبوترے پر چڑھ گیا۔ ہر روشن دان کے نیچے ایک ایک
چبوترہ بنا ہوا تھا۔ شاید ان چبوتروں پر چڑھ کر ہی پروفیسر کے آدمی
روشن دانوں میں سے جھانکتے تھے...

وہ خنجر کو اپنی آنکھ سے دور رکھنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔
اب چونکہ وہ انسپکٹر جمشید سے اونچی جگہ پر تھا، اس لیے اس کا زور
زیادہ پڑ رہا تھا... دیکھتے ہی دیکھتے خنجر کا رُخ مڑا اور نوک انسپکٹر
جمشید کی گردن کی طرف بڑھنے لگی۔ انہوں نے محسوس کیا، اگر چند
سیکنڈ اور یہ حالت رہی تو خنجر ان کی گردن تک پہنچ جائے گا...
انہوں نے اپنے ذہن پر زور دیا اور پھر فوراً ایک ترکیب انہیں
سوجھ گئی... وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ آئے۔ پروفیسر
کے پاؤں چبوترے پر سے اکھڑ گئے... وہ لڑکھڑا گیا اور یہی وہ
وقت تھا جب خنجر یک لخت مڑا اور پروفیسر کی آنکھ میں اتر گیا۔
اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ اس قدر دل دوز تھی کہ پتھر کا
وہ مکان تک لرز اٹھا... آواز اس قدر ہولناک تھی کہ خان رحمان
... محمود، فاروق اور فرزانہ بھی ہوش میں آگئے۔ انہوں نے
آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یہ منظر دیکھا..... انہیں اپنا کوئی ہوش نہیں
تھا، حالانکہ سب زخمی تھے۔ پروفیسر کو تڑپتے دیکھ کر وہ اتنا
خوش ہوئے کہ اپنی زندگی میں کبھی نہ ہوئے ہوں گے۔ پروفیسر پاگلوں
کی طرح چیخ رہا تھا۔ انسپکٹر جمشید نے ایک خاص قسم کی رسی جیب
سے نکالی اور اسے جکڑنا شروع کر دیا۔ اس رسی کو ہاتھوں سے توڑنا
ناممکن... پھر وہ دوسرے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں ایک پلنگ
پر پروفیسر بندھے پڑے تھے دوسرے پر شاہد منیر تھا... ان
کے ساتھ ایک تیسرا آدمی بھی تھا۔ جب اس نے اپنا نام انوار احمد
صدیقی بتایا، تو وہ سمجھ گئے کہ یہی وہ مہمان ہے جو آئی جی صاحب کے
ہاں سے غائب ہوا تھا۔ تینوں بہت کمزور ہو چکے تھے۔ پروفیسر
داؤد نے انہیں بتایا کہ انہیں بھی لہروں میں تبدیل کر کے یہاں لایا
گیا تھا... لہروں کو یہاں وہ پھر سے انسانی صورت میں ڈھال
لیتا تھا۔ اس کام کے لیے اوپر پوری لیبارٹری بنی ہوئی ہے...
تیسرے کمرے سے صاحب صدر اور وزیر اعظم بھی برآمد کر لیے گئے۔

اس کے بعد وہ اوپر چڑھے تاکہ اس حیرت انگیز تجربہ گاہ کو دیکھیں جس کے ذریعے یہ سارا کام کیا جاتا تھا۔ یہاں ہر طرف مشینیں نصب تھیں۔ ان میں لاکھوں بجلی کے تار اور ہزاروں رنگ برنگے بٹن لگے ہوئے تھے ... ایک طرف ایک سینما کی سکرین جتنا ٹیلی ویژن موجود تھا۔ پروفیسر نے بتایا کہ اس پر پروفیسر کیکاؤس سارے شہر اور ارد گرد کا علاقہ دیکھتا تھا ... اور جسے لہروں پر تبدیل کرنا چاہتا تھا، اس پر فوکس کر کے مشین چلا دیتا تھا۔ پہلے وہ شخص بے ہوش ہوتا، پھر اس کا جسم برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا ہوتا اور اس کے چند منٹ بعد وہ دھوئیں میں تبدیل ہونے لگتا ... یہ دھواں دراصل لہریں ہوتی تھیں ، دوسرے دن انسپکٹر جمشید سب لوگوں کے سامنے پروفیسر کیکاؤس کی کہانی سنا رہے تھے :

"دراصل یہ کہانی بارہ سال پہلے شروع ہوئی جب پروفیسر کیکاؤس نے ایک مضمون لکھا۔ اس نے مضمون میں لکھا تھا کہ وہ ایک ایسی دیوار بنا سکتا ہے جس پر گولی، بم یا کوئی ہتھیار اثر نہیں کر سکتا اور یہ کہ وہ دیوار دور سے نظر بھی نہیں آ سکتی ... اس کا یہ مضمون دشمن ملک نے بھی پڑھا۔ انھوں نے فوراً اس سے رابطہ قائم کیا اور اپنا پروگرام اسے بتایا۔ انھوں نے کہا کہ وہ اسے مرمر آباد کی پہاڑیوں پر ایک مکان بنوا دیں گے ... اس مکان کے اوپر وہ تجربے کے طور پر وہ چادر بنا کر دکھائے ... چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

پروفیسر کچھ اور بھی تجربات کرتا رہتا تھا۔ ایک دن اس نے دشمن ملک کے جاسوسوں کو اطلاع دی کہ وہ آدمی کو لہروں میں تبدیل کر کے غائب بھی کر سکتا ہے ... دشمن ملک والوں نے اس سے کہا کہ وہ ایسا کر کے دکھائے ... چنانچہ اس نے اس مکان پر تمام سائنسی آلات جمع کر لیے اور پوری تجربہ گاہ بنا ڈالی .... یہاں ٹیلی ویژن سٹیشن بھی قائم کر لیا جو اس قدر طاقت ور تھا کہ جب اسے آن کر دیا جاتا تو دوسرے سٹیشن ناکارہ ہو جاتے۔ اس طرح وہ ٹیلی ویژن پر آنے میں کامیاب ہوا۔ دوسری طرف اس نے ٹیلی ویژن کے ایسے کیمرے نصب کر لیے کہ پچاس میل کے اندر کسی بھی علاقے کو جب بھی چاہے اپنی آنکھوں سے سکرین پر دیکھ سکتا تھا۔ اس طرح وہ ایک دن شہر کا منظر دیکھ رہا تھا کہ اسے آئی جی صاحب کا مہمان خانہ نظر آیا۔ اس اس نے لے لہروں میں تبدیل کر کے غائب کر دیا ... ہم پروفیسر سے رابطہ قائم کرنے لگے تو اس نے انھیں بھی غائب کر دیا ... شاہد منیر کے پاس پہنچے تو اسے ہماری آنکھوں کے سامنے غائب کیا ... مقصد صرف یہ تھا کہ یہ اپنی طاقت دکھانا چاہتا تھا۔ پھر دشمن ملک کے کہنے پر ٹیلی ویژن پر آیا اور تقریر کی ... تاکہ ملک میں افراتفری پھیلے ... ایسا ہی ہوا پھر جب صدر صاحب اور وزیر اعظم صاحب غائب ہو گئے تو بوکھلاہٹ میں اور بھی اضافہ ہو گیا ... ادھر دشمن ملک نے سوچا،

اب حملہ کرنے کا اچھا موقع ہے۔ انھوں نے پروفیسر صاحب سے
کہہ دیا کہ کامیاب ہونے کی صورت میں پورا ملک ان کے حوالے
کر دیا جائے گا لیکن وہ ایسا ہرگز نہ کرتے... پروفیسر کو اپنا قیدی
بنا لیتے اور اس سے کام لیتے رہتے۔ دوسری طرف پروفیسر نے سائنس
کی مدد سے تیار کی گئی عجیب و غریب دوائیں کھا کر اپنا جسم لوہے کی طرح
سخت بنا لیا تھا تاکہ کوئی اسے شکست نہ دے سکے... اور سچ تو یہ
ہے کہ میں اور خان رحمان بھی شکست سے دوچار ہو گئے تھے...
یہ تو محمود، فاروق اور فرزانہ تھے جنھوں نے لوہے کے اس پہاڑ
سے ٹکر لی... ورنہ اس وقت صورت حال کچھ اور ہوتی... آخر
میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ یہ صاحب ہیں کون... تو لیجیے... یہ
ہیں مرمرآباد کے ڈاکٹر شیفرڈ... اور پروفیسر ذاکر کے گم شدہ
دوست شبیر انور... یہ اسی لیے غائب ہو گئے تھے کہ دشمن
ملک نے ان سے رابطہ قائم کر لیا تھا۔ انھوں نے اپنے چہرے
میں کوئی تبدیلی کی اور مرمرآباد میں رہنے لگے، پھر ڈاڑھی رکھ لی..
.. اور یہ ڈاڑھی مصنوعی تھی... اس ڈاڑھی کے ساتھ یہ ڈاکٹر شیفرڈ
کی صورت میں لوگوں کے سامنے آتے... ٹی وی پر آتے تو ڈاڑھی
اتار دیتے... لیکن چونکہ یہ بھی ان کی اصل صورت نہیں تھی، اس لیے
پروفیسر ذاکر بھی انھیں ٹی وی کی سکرین پر دیکھنے کے باوجود نہ پہچان
سکے کہ یہی ان کا گم شدہ دوست ہے... یہاں آپ لوگ شاید یہ

سوچیں کہ یہ تو سائنس داں تھے، ڈاکٹر کیسے بن گئے، تو اس کا جواب
یہ ہے کہ اپنے ملک سے یہ ایم بی بی ایس کر کے ہی یہاں چھپے تھے۔
اب میں آپ کو ان کا چہرہ بھی دکھاؤں۔ کیوں کہ یہاں پروفیسر
ذاکر بھی تو موجود ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھے اور پروفیسر کیلاؤس کے چہرے سے ڈاڑھی
نوچ لی۔ یہ وہی صورت تھی جو وہ ٹی وی پر دیکھتے رہے تھے۔ انسپکٹر
جمشید ایک بار اور جھکے اور اس کی ناک کے نتھنوں میں انگلیاں ڈال
کر ایک جھٹکا دیا... پلاسٹک کا ایک ٹکڑا سا انسپکٹر جمشید کے ہاتھ
میں آ گیا۔ دوسرے ہی لمحے انھوں نے پروفیسر ذاکر کی چیخ سنی:

"آہ میرے دوست۔ تو نے یہ کیا کیا؟"

مگر ان کے دوست کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا... ان
کی ایک آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور دوسری آنکھ شرم سے بند
ہو گئی تھی... ان کی زندگی کا حیرت انگیز ترین مجرم ان کے سامنے
پڑا تھا اور وہ سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہے تھے۔